ہفت روزہ

پربھات

نواب شاہ

۱۱ر اگست ۱۹۷۸ء

ترقی پسندو! پتہ چلا ہے کہ...

ایک انتہائی اہم رپورٹ

صفحہ ۷

عبدالسلام جلود کا دورہ اور بھٹو

صفحہ ۵

قیمت ۴ر روپے

بائیں بازو والو متھی بن جاؤ

اچانک پاکستان میں مارشل لا انتظامیہ کے ایک اہم ستون جنرل فیض علی چشتی کی برطانیہ میں پُراسرار آمد کی خبر پاکستان ریڈیو اور بی بی سی سے نشر ہوئی۔ بیٹھی ایسے انداز میں ہوئی کہ ہم نے سمجھا شاید جنرل چشتی صاحب ری پروسیسنگ پلانٹ کے سلسلے میں برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کو احوال واقعی سے آگاہ کرنے کے پیچھے ہیں اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے سنا کہ جناب فیض علی چشتی نے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں سے خطاب کے دوران بھٹو پر زبردست حملے کئے اور مارشل لا انتظامیہ کے وہائٹ پیپر کو بڑے فخر سے دکھایا اور اس کارنامے پر بڑے فخر سے داد حاصل کرنے کی کوشش کی داد تو وہ خیر کیا حاصل کرتے البتہ اخباری اطلاع اور بی بی سی کے مطابق ہزاروں پاکستانیوں نے ان کے اور حکومت کے خلاف زبردست نعرے لگائے اور نفرت کا اظہار جس انداز سے کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہائٹ پیپر پر حکومت نے جو لاکھوں روپے خرچ کیے ہیں اس کی بربادی سے کیا فائدہ حاصل کریگی برطانیہ ایک جمہوری ریاست ہے وہاں کے عوام سمجھدار اور باشعور ہیں کیا وہ اس بھونڈے انداز کی پبلسٹی پر یقین کرینگے ہرگز نہیں۔

(جاوید جبار - حیدرآباد)

قرطاس ابیض: نوکرشاہی کے جھوٹ کا پلندہ

۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کے خلاف کردارکشی کی جو مہم چلائی جا رہی ہے اس سلسلے میں اب تک جو کچھ کیا گیا ہے پاکستان کے باشعور عوام نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اپنی اس ناکامی کے بعد ایک اور سوشہ "قرطاسِ ابیض" کی صورت میں چھوڑا گیا ہے "قرطاسِ ابیض" ایک جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں ہے اس جھوٹ کے بارے کہ حمایت میں ہمارے ملک کے جو سیاستدان بیان دے رہے ہیں وہ حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ دھاندلیاں کس نے کی تھیں خود کو بے قصور ثابت کرکے سارا الزام پیپلز پارٹی پر عائد کرنے والے یہ کیوں بھول گئے کہ ان کی کارکردگی سے بھی عوام واقف ہیں چاہے اس کی کتنی ہی پردہ پوشی کی جائے پاکستان کے عوام جھوٹ اور سچ اچھے اور بُرے کی تمیز کر سکتے ہیں۔ اب انہیں اور زیادہ بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے لوگوں پر جو ظلم اور ناانصافیاں ہو رہی ہیں اور مختلف انداز سے ہر محکمے میں دھاندلیاں ہو رہی ہیں آنے والی مستقبل کی نئی حکومت اس پر بھی کوئی قرطاسِ ابیض شائع کریگی اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اور یہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے لیے مفید نہ ہوگا کیونکہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور پارٹی کے خلاف اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک جو پروپیگنڈہ ہو رہا ہے اس کے لیے کافی رقم درکار ہوتی ہے ایک طرف تو عوام کو کفایت شعاری کی تلقین کی جا رہی ہے تو دوسری طرف عوام کی محنت سے بچایا ہوا روپیہ انتقامی کارروائیوں کے لیے خرچ ہو رہا ہے یہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا اچھا طریقہ ہے پاکستان کے صحافی حق کی خاطر جو قربانیاں دے رہے ہیں انکی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ خدا آپ صحافیوں کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے (آمین) اور پاکستان کو موجودہ بحران سے نکالے (آمین)

ایس ملقیں مرزا بہاولپور

بائیں بازو کا اتحاد کب تک

عوام کا الفتح نت نئے روپوں میں بلاناغہ ملتا ہے لیکن ایک چیز بُری طرح کھٹکتی ہے کہ آپ آج پاکستان کے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف بھٹو صاحب کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات تاریخی طور پر غلط ہے کیونکہ بھٹو کا طبقاتی کردار ایسا ہے کہ وہ اس ملک کے عوام اور محنت کشوں کے مفاد کے لیے کوئی عظیم کارنامہ سرانجام نہ دے سکے اور نہ دے سکتے ہیں اس لیے آپ سے گذارش ہے کہ آپ اس سلسلے میں متوازن رہیں اور بھٹو کی شخصیت ابھارنے کی بجائے بائیں بازو کی لیڈرشپ کو عوام میں روشناس کرائیں۔ کیونکہ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں اور ہمارے دوسرے تمام ترقی پسند دانشور بھی کہ اس ملک میں کوئی بھی انقلابی تبدیلی لانے کی صلاحیت نہ تو بھٹو صاحب میں ہے نہ ولی خان، مفتی محمود اور اصغر خان وغیرہ میں ہے اس لیے آج ترقی پسند جریدوں اور دانشوروں کا یہ تاریخی فرض بنتا ہے کہ وہ پاکستان کے محنت کشوں کو بورژوا لیڈرشپ کے ریب سے باہر نکال کر بائیں بازو کی سیاسی ٹولیوں میں منظم کرنے کی کوشش کریں اور ساتھ ہی ساتھ بائیں بازو کی مختلف پارٹیوں کو آپس میں قریب لانے کی جدوجہد کریں آج اس ملک میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی بھی موجود ہے۔ اور نیشنل پروگریسو پارٹی بھی، مزدور کسان پارٹی بھی ہے اور قومی محاذ آزادی بھی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ سی آر اسلم، معراج محمد خان، ڈاکٹر اعزاز نذیر، رسول بخش پلیجو، افضل بنگش عابد حسن منٹو، چوہدری فتح محمد، تاج محمد لنگاہ، میجر محمد اسحٰق اور ان جیسے دوسرے مقتدر رہنما اتحاد کی جانب پیش قدمی نہیں کرتے کیا ہمارے مقتدر رہنما تاریخ کے مجرم بننا چاہتے ہیں آج یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ سوشلزم اس ملک میں آکر رہے گا پھر کیوں نہ ہم سوشلزم کی راہ میں کھڑی رکاوٹیں دور کریں اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ہمارا پہلا کام آپس میں اتحاد ہے اس لیے میں آپ سے اور دوسرے تمام ترقی پسند دانشوروں سے انسانیت کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ آپ آگے آئیں اور بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں میں اتحاد کروانے کے لیے الفتح کے ذریعے محنت کشوں کو متحرک کریں تاکہ بائیں بازو کی لیڈرشپ آپس کے اختلافات ختم کرکے اتحاد و یگانگت کی بات کر سکے۔

شیردل مہمند - پشاور

وہائٹ پیپر نے حکومت کا پول کھول دیا

موجودہ حالات کی روش یقیناً حوصلہ افزا نہیں نام نہاد قومی اتحاد کی سڑی ہوئی لاش کا تعفن پورے ماحول کو بدبودار کر رہا ہے مگر مفتی محمود اور حمایتیے اس غلاظت کے انبار کو اب بھی سروں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے مخصوص کردار کی نشاندہی کر رہا ہے۔ دوسری طرف بے بنیاد قرطاس ابیض کی اشاعت نے حکومت کی رہی سہی غیر جانبداری کا بھرم بھی کھو دیا۔ اور بالخصوص مسلم لیگ کے ایک سرکاری جماعت کی حیثیت سے سامنے آنے کے بعد اور غیر منتخب بدنام زمانہ افراد پر مشتمل کابینہ کے قیام نے یہ واضح کر دیا ہے کہ انتخابات اب نہیں ہونگے۔ دائیں بازو کے موقع پرست طالع آزما سیاستدان تو دل سے نہیں چاہتے کہ اس ملک میں جمہوری اداروں کا قیام عمل میں آئے ان کی رجعت پسندانہ فطرت تو صرف اس کاوش کے لیے برسرپیکار ہے کہ ملک کے محنت کش عوام کو جبر و استبداد سے دبایا جائے اور ان کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ مستحکم کیا جائے۔ دوسری طرف بائیں بازو کے ترقی پسند مختلف دھڑوں میں منقسم ایک دوسرے سے ابھی تک نبرد آزما ہیں کیا یہ وقت نہیں کہ وہ اپنے فروعی اختلافات کو پس پشت ڈالتے ہوئے یکمشت ہو جائیں کیا عوامی جمہوری اتحاد ناممکن ہے کیا ہماری شناخت کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ ہم سامراج دشمن ہیں اور مزدور کسان راج چاہتے ہیں کیا وسیع تر متحدہ محاذ کی صورت میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد نہیں بن سکتا۔ کیا ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد پاکستانی معاشرے کے حوالے سے تضادات کی ہیئت تبدیل نہیں ہوتی یہ وہ سوالات ہیں جو آج ہر ترقی پسند کارکن کے ذہن کو پریشان کر رہے ہیں

ثمینہ کوثر - پشاور

جرم بے گناہی

امید ہے آپ ظلم و استبداد کے خلاف برسرِ پیکار ہونگے۔ حق گوئی کا شیوہ جو آپ نے اپنایا ہے رب جلیل اس میں وسعت بخشے۔ آمین ثم آمین۔ میں پچھلے دنوں حبیب اللہ شاکر صاحب کے لئے کچھ سامان اور اخبارات لے کر جا رہا تھا کہ تلاشی ہو گئی۔ جس کی پاداش میں میں آجکل زیر عتاب ہوں اور پنشمنٹ بلاک میں بند ہوں ویسے میں یکم اگست کو رہا ہونے والا تھا اب شاید قید ایک یا دو ماہ اور بڑھ جائے انسانیت کی تذلیل کے مناظر جو میں آجکل دیکھ رہا ہوں روح کانپ جاتی ہے۔ خیر۔ اچھے بُرے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار ہوں۔

ڈاکٹر خادم علی

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
واحد بشیر

کالم نگار
حسین نقی، شبیہہ الحسن

طنز و مزاح
ابوضیا اقبال

انتظامی امور
حاجی عدیل

سرورق
سعید الدین حسین

پبلشر
عبدالفتاح ابڑو
مقام اشاعت
دفتر ہفت روزہ
پربھات، پھری روڈ، نوابشاہ

پرنٹر
سید ناصر علی
مطبع
یوروپ پرنٹنگ پریس کراچی

دفترِ رابطہ

مطبوعات

۶۹-۵، ڈی زرری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس، کراچی — ۲۹
فون: ۴۳۲۲۷۴

ہفت روزہ

نواب شاہ

•

چیف ایڈیٹر: عبدالفتاح ابڑو

•

جلد: ۸ شمارہ: ۲۴

۱۱ اگست ۱۹۷۸ء
قیمت ۳ روپے

خاص مضامین

اسلام آباد
ذوالفقار حیدری

ضلعی نمائندے

میرپور خاص
محبوب احمد

فیصل آباد، گوجرانوالہ
طارق سعید
محمد افضل جنجوعہ

سانگھڑ
میرپور، سکھر
جیکب آباد، لاڑکانہ
کامران ابڑو

شیخوپورہ
ٹوبہ ٹیک سنگھ
غیاث الدین جانباز

ایاز سندھی

گوادر
سلیمان شیرف

ٹنڈو الہ یار
کامل سمعون

میانوالی
روشن ملک

ملتان
ناصر زیدی

آزاد کشمیر
سید نذیر گیلانی

صوبائی نمائندے

سندھ مقیم حیدرآباد
احسان عظیم

پنجاب مقیم لاہور
کاشف

سرحد مقیم پشاور
شہزاد غزنوی

بلوچستان مقیم کوئٹہ
ناصر عرفات

غیر ممالک

پیکنگ
رشید بٹ

ماسکو
محمد زاہد

کینیڈا
سعید ابن سعود

لندن
عبدالحفیظ قریشی

یورپ فاروق طارق

متحدہ عرب امارات

ڈی [illegible] نمبر [illegible]

حکومت کے زیرِ انتظام ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی اور ٹرسٹ کے اخبارات جس حد تک معتبر ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہر آنے والی حکومت نے جانے والی حکومت اور اس کے سربراہ پر الزام لگایا (زیادہ صحیح اصطلاح مجرم قرار دینا ہوگی) کہ ان ذرائع کو اس نے غلط طریقے پر استعمال کیا اور سربراہ کی ذات کی شہرت کے لئے وقف کر دیا۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے بلکہ ایسی حقیقت ہے جس کے خلاف اخباری صنعت کے کارکن احتجاج کرتے رہے ہیں اور ان کی آزادیٔ صحافت کی موجودہ تحریک کا بنیادی مقصد پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس کی تنسیخ ہے۔ دوسری طرف ملک بھر کے عوام ان ذرائع کی خبروں کو سرکاری اعلانات سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ان پر اعتبار نہیں کرتے۔ اور صحیح صورتِ حال سے واقفیت کے لئے بی بی سی پر انحصار کرتے ہیں۔
ممکن ہے کہ ذرائع ابلاغ کے کارپرداز اور انہیں احکامات جاری کرنے والے اس صورتِ حال سے مطمئن ہوں مگر ہم جیسے لوگ اسے قومی زندگی کا ایک المیہ اور باعثِ شرم سمجھتے ہیں۔ آزادیٔ صحافت کے لئے اخباری کارکنوں، طلبا، کسانوں اور مزدوروں کی موجودہ جدوجہد اسی صورتِ حال کے خاتمے کی کوشش ہے اور یہ کوشش کامیابی کے حصول تک جاری رہے گی۔

اسی بی بی سی نے ۳، ۴ روز قبل دو خبریں نشر کیں۔ ایک یہ کہ پاکستان کو ری پروسیسنگ پلانٹ کی خریداری پر اصرار کی یہ سزا دی گئی ہے کہ اس کی اقتصادی امداد بند کر دی گئی ہے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ کنسورشیم نے پاکستان کی گیہوں کی اضافی فراہمی کی درخواست مسترد کر دی ہے۔

موجودہ مارشل لا حکومت کے ترجمان نے گیہوں کی فراہمی کی درخواست کے مسترد ہونے کی تردید کی اور اس خبر کو جھوٹ قرار دیا لیکن گھما پھرا کر یہ تسلیم کیا کہ یہ درخواست منظور نہیں ہوئی ہے۔ اور عوام کو پریشانی سے بچانے کے لئے گیہوں کی درآمد کے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ بارش سے سڑے ہوئے گندم کا رنگ اور بدبو دار آٹا کھا کر بیماریوں کا شکار ہونے والے عوام کس حد تک مطمئن ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

ری پروسیسنگ پلانٹ اور اس سلسلے میں امریکی اقتصادی امداد پر پابندی کی وضاحت کرتے ہوئے سرکاری ترجمان نے دو باتیں کہی ہیں۔ پہلی یہ کہ اقتصادی امداد اس وقت بند نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ پابندی اپریل ۱۹۷۷ء یعنی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں عائد کر دی گئی تھی۔ دوسری بات ترجمان نے یہ کہی کہ پاکستان کی اقتصادی امداد بند کرنا باعثِ حیرت ہے کیونکہ خود امریکی حکام معترف ہیں کہ پاکستان نے کسی امریکی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ پہلی وضاحت سے مسٹر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ امریکہ بھٹو صاحب کی پالیسیوں سے اس حد تک ناراض تھا کہ اس نے انہیں اقتدار سے محروم کرنے کی نہ صرف دھمکی دی (کسنجر کی دھمکی کے حوالے سے) بلکہ انہیں عملاً اقتدار سے محروم بھی کروا دیا۔ دوسری وضاحت صحیح معنی میں معذرت ہے اور عوام کو شدت سے احساس دلاتی ہے کہ امریکی امداد غیر مشروط نہیں ہے بلکہ امداد لینے والے ممالک کو اس کی پالیسیوں اور احکام سے سرتابی کی مجال نہیں ہو سکتی۔

اسی بی بی سی نے فرانس کی متبادل تجاویز اور ری پروسیسنگ پلانٹ کے لئے ہونے والے تعمیراتی کام کے بند کئے جانے کی بھی خبر دی تھی۔ اس بارے میں سرکاری ترجمان کی خاموشی معنی خیز ہے۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم مارشل لا حکومت یا کسی اور طرح کی غیر منتخب حکومت سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ اس بارے میں عوام کو اعتماد میں لے۔ اس لئے ہم پھر اسی مطالبے کو دہراتے ہیں کہ جلد از جلد انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے تاکہ داخلی اور خارجی مسائل سے موثر طور پر نمٹا جا سکے اور پاکستان کو بین الاقوامی برادری میں وقار حاصل ہو سکے۔

فالکن یاد ماضی ہے تو بوئنگ حال کی عکاسی کر رہا ہے

عبدالسلام جالود کا دورہ اور بھٹو

عبدالسلام جالود نائب صدر لیبیا

لیبیا نے اقتصادی امداد بھٹو کی رہائی سے مشروط کر دی ہے

فلسطینی سفارت کاروں کی شہادت اور حفاظتی کوتاہیاں

ذوالفقار حیدری

لیبیا کے نائب صدر جناب عبدالسلام جالوت پاکستان کا دورہ کر کے پیکنگ چلے گئے ہیں۔ باخبر ذرائع کے مطابق وہ وطن واپسی پر پاکستان کا دورہ کرتے ہوتے جائیں گے۔ جناب عبدالسلام جالوت کا یہ دورہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان کی ملٹری جنتا نے لیبیا سے باضابطہ امداد کی درخواست کی تھی اور جناب جالوت اس درخواست پر ہی بات چیت کرنے کیلئے پاکستان تشریف لائے تھے۔ لیبیا اور پاکستان کے تعلقات

یوسف ابوحنطاش پریس کانفرنس سے مخاطب ہیں۔

معزول وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں انتہائی دوستانہ تھے۔ لیبیا کے صدر جناب کرنل معمر قذافی جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ذاتی دوست ہیں اور پاکستانیوں کو بھی ان کی دوستی پر بجا فخر ہے۔ جناب قذافی دنیا بھر کے ممالک میں پہلے سربراہ مملکت ہیں جنہوں نے کسی دوسرے ملک میں جا کر عام جلسوں سے خطاب کیا۔ یہ فخر پاکستانیوں کو ہی حاصل ہوا کہ جناب قذافی نے ان سے کئی شہروں میں عام جلسوں میں خطاب کیا۔ اس پس منظر میں جب جناب قذافی نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ملٹری جنتا کا معاندانہ رویہ دیکھا تو انہوں نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرنا شروع کیا مگر دوست ممالک کی ان اپیلوں کو یکسر مسترد کر دیا اور ایک وقت ایسا آگیا کہ سامراجی طاقتوں کے اشارے پر ناچنے والے اکیلے رہ گئے۔ ایران نے پاکستان کو دیا جانے والا قرض اب تک گارنٹی نہیں کیا ہے۔ سعودی عرب نے بھی کوئی مالی امداد نہیں دی۔ کشور شیم ممالک بھی امداد کا صحیح وعدہ نہیں کر سکے۔ دوست ممالک نے جب اپنی باتوں کی ناقدری دیکھی تو انہوں نے بھی امداد کی درخواستوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور چچا سام نے بھی ایک سال سے امداد نہیں دی تھی۔ لیبیا کی پیپلز کانگریس نے پاکستان کی امداد کرنا چاہی مگر ہمارے رہنماؤں کو ان سے نہ جانے کیا بغض تھا کہ جب کانگریس کے سربراہ پاکستان آئے تو ان کو بھی مایوس لوٹا دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی دشمنی میں دور تک نکل جانے والوں نے جب اپنی سالگرہ کے موقع پر ادھر ادھر دیکھا تو انہیں لذتوں کے صحرا میں امید کا کوئی نخلستان نہیں نظر آتا تھا۔ ملک کو بچانے کا دعویٰ کرنے والے جب ملک کو تباہ کرنے لگیں تو وقت تاریخ ان کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔ ملک کے ایک حصہ کا حشر کر دینے والے اب بچے کھچے پاکستان کو بھی سامراجی طاقتوں کے اشارے پر ناچنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ برسر اقتدار گروہ ایک جیسی سوچ نہیں رکھتا اسی لئے ایک بار پھر لیبیا سے مالی امداد مانگی گئی ہے۔ لیبیا کے نائب صدر جناب عبدالسلام جالوت نے ایک اعلیٰ سطحی وفد کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کیا۔

اس دورے کے دوران ہی امریکہ نے پاکستان کی اقتصادی امداد بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ امریکہ نے یہ اقدام پاکستان کو فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ خریدنے سے روکنے کے لئے کیا ہے مگر یہ بھی ایک ڈرامہ ہے جس کا ڈراپ سین بہت جلد ہونے والا ہے۔ ڈرامہ یہ ہے کہ امریکہ نے اقتصادی امداد بند کرنے کا اعلان عین اس وقت کیا جب لیبیا کے نائب صدر پاکستان کا دورہ کر رہے تھے جناب جالوت جن شرائط پر پاکستان کو اقتصادی امداد کی پیش کش کرتے رہے وہ ملٹری جنتا کو کسی بھی صورت میں قبول نہیں وہ شرط واحد یہ ہے

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

ہلاک ہونے والا سپاہی محفوظ

چوہوں نے دفتر اور گھر میں جینا دوبھر کر دیا ہے

محاسبے کی ابتدا ۔ جنرل چشتی اپنے آپ سے کریں

بھٹو کے لئے اسلام آباد جنت ارضی سے کوفہ کیونکر بن گیا

حسین نقی

یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے اس سے بہت پہلے کی جب موجودہ حکومت نے پنجاب میں تمام موٹر سائیکل، سکوٹر سواروں کے لیئے ہلمٹ کو لازمی قرار دیا۔ جب میری بیگم نے یہ محسوس کیا کہ ہماری ساری قوم کو کنٹوپ پہنا دیا گیا ہے۔

کنٹوپ سردی سے بچاتا ہے اور ہمارے بچپن میں جب فیشن سے زیادہ ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا جاڑوں میں ہماری اماں ہمیں کنٹوپ پہن لینے پر ہی گھر سے باہر جانے دیتی تھیں۔ مجھے کنٹوپ سے کوئی خاص چڑ نہیں ہے البتہ اس کے پہننے سے بال بے ترتیب ہو جاتے ہیں اور یہ صورتحال آج تک موجود ہے لیکن میری بیگم کے خیالات کنٹوپ کے سلسلے میں کچھ اور ہیں ان کا خیال ہے کہ ہمارے درمیانے طبقے کا دماغ پہلے ہی سے بند بند سا ہے اس پر سے اس کو کنٹوپ پہنا کر بالکل بند کر دیا گیا ہے کہ کوئی تازہ ہوا کا جھونکا بھی غلطی سے اس میں نہ چلا جائے چنانچہ اگر آپ کبھی کوئی بے عقلی کی بات کریں (جو میں اکثر اور بہتات سے کرتا رہتا ہوں) تو میری بیگم کہیں گی یہ پھر تم نے کنٹوپ پہن لیا۔

کنٹوپ کے خلاف ان کی مہم ہلمٹ کے خلاف مہم سے پہلے کی جاری ہے اور چونکہ ہلمٹ بھی کنٹوپ ہی کی ایک شکل ہے لہٰذا میری بیگم اس کے خلاف مہم کو کنٹوپ کے خلاف مہم خیال کرتی ہیں۔ اور خوش ہیں کہ ہلمٹ کے ساتھ ساتھ شاید کنٹوپ اترنے میں بھی مدد ملے گی۔

لاہور ۔ لاہور ہے اور یہ واردات یہیں ہو سکتی تھی اور ہوئی کہ چند نوجوانوں نے حجام سے پہلے تو ٹنڈ کرائی یعنی سر پر اُسترا پھروایا یہ تو خیر بالکل دینی رویہ ہے اور بحمداللہ ہمارے نوجوانوں کی دین سے وارفتگی کا ثبوت بھی، پھر اس ٹنڈ کو سرخ پینٹ کروا لیا اور پھر درمیان میں یعنی مانگ کی جگہ موٹی کالی یا سفید پٹی پینٹ کروائی کسی نے تو بوزنا کا گودا اکھا کر خول آدھا سر پر ڈھانپ لیا اور دونوں سروں پر دھاگہ ڈالکر تھوڑی سے نیچے ڈیڑھ گانٹھ باندھ لی۔ بعض لوگ پلاسٹک کے ڈونگے سر پر ڈھانپ آئے اور کسی نے المونیم کا پیالہ یا پتیلی اوڑھ لی۔

اب اگر آپ نے ۱۸۵۷ء اور اس کے دور کے واقعات سن رکھے ہیں تو لکھنؤ کے بانکے بھی کچھ اسی قسم کی حرکتیں کرتے تھے مثلاً ایک گال پر استرا پھرواتے اور دوسرے پر داڑھی کے بال بڑھا لیئے یا بڑی بڑی قلمیں رکھتے جاڑوں میں ڈھاکہ کی ململ کا انگرکھا پہن کر دریا کی سیر کو نکلتے پڑھے لکھے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سب ایک قسم کا احتجاجی مظاہرہ ہوتا لیکن اس سلسلے میں ایک نوجوان نے عجیب و غریب حرکت کی اس کے باپ نے بیٹے کو بتایا کہ شہنشاہ یا شاہ کے پاس تمہاری ناپسندیدہ اور باغیانہ سرگرمیوں کی اطلاعات پہنچ رہی ہیں اور وہ ان حرکات پر سخت نالاں ہیں ممکن ہے کہ تمہیں ان حرکات پر سزا دی جائے بانکے بیٹے نے پوچھا مثلاً کیا سزا ہو سکتی ہے تو والد صاحب نے فرمایا کوئی بھی سخت اذیت مثلاً تمہارے ایک کان کاٹ دیئے جائیں۔ بانکے بیٹے نے اپنی قرولی نکالی ایک کان کاٹا اور شاہ کے مصاحب والد بزرگوار کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ وہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور جس عضو کی ضرورت زیادہ محسوس کریں اس کے متعلق اطلاع کر دی جائے حاضر خدمت کر دیا جائے گا جب وہ کٹا ہوا کان بادشاہ تک پہنچا تو بادشاہ حیران ہو گیا۔ اور آئندہ باپ سے بیٹے کی کبھی بھی شکایت نہ کی۔

کنٹوپ، ہلمٹ اور بانکے کے کان کے علاوہ جو بات میں آپ کو بتانا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ میرے گھر اور دفتر میں چوہوں نے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے کاغذ چاہے کاڈ بر، روٹی کا پیکٹ سب کچھ کاٹ کر ضائع کر رہے ہیں حتیٰ کہ صبح میں نے خواب میں دیکھا کہ جو دو امریکی مصنفین کی کتابیں میں میز پر چھوڑ کر اٹھا تھا وہ بھی چوہے کاٹ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ہے جس کا عنوان ہے "A NATION OF SHEP" یعنی بھیڑوں کی (بھیڑیوں کی نہیں) قوم ۔ موصوف ایک امریکی مصنف ہیں اور امریکی قوم کے متعلق ان کے اس قدر باغیانہ اور تضحیک آمیز خیالات ہیں کہ انہوں نے امریکیوں کو "بھیڑوں کی قوم" کہا۔ اس کتاب میں امریکی آزاد پریس کے متعلق ان کا کہنا یہ تھا کہ سارے امریکہ میں ایک درجن بھر قابل اعتبار صحافیوں کے علاوہ باقی کا دھندہ قوم کو ہاتھ دکھانا ہے مثال میں انہوں نے ایک واقعہ یہ بیان کیا کہ دیت نام پر دو معروف صحافیوں اور ایک ٹی وی ٹیم نے ایک فلم بنائی جس میں ایک دیت نامی جو ایک مترجم کے ذریعہ بول رہا تھا مبینہ طور پر کمیونسٹ خطرہ کے

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

ترقی پسندو! پتہ چلا ہے کہ ....

سیاسی مبصر کے قلم سے

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے "بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے عناصر" کی تین قسمیں بنائی ہیں:

کٹر کمیونسٹ

ٹریڈ یونینسٹ

ڈھلمل یقین مخالف

کٹر کمیونسٹوں کی تعریف میں ان لوگوں کو لایا گیا ہے جو مارکسی نظریہ رکھتے ہیں اور پوری تندہی سے کمیونسٹ اغراض و مقاصد کو دانشوروں سے لے کر ایک عام آدمی تک سوسائٹی کے سارے حلقوں میں پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ ان میں سے بیشتر روس نواز کمیونسٹ ہیں جو نظریاتی طور پر چینی طرز کے مارکسیوں اور لیننوں سے الگ ہیں۔ گو کہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر ۱۹۵۴ء میں پابندی لگی تھی لیکن سیاسی پارٹیوں کے قانون مجریہ ۱۹۶۲ء سے یہ پابندی موثر نہیں رہی ہے لیکن کمیونسٹوں نے اپنی پارٹی کا احیا نہیں کیا ہے۔ اس کی بجائے دوسری تنظیموں کے ذریعے یہ آسانی کام کر رہے ہیں۔

ٹریڈ یونین سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ بنیادی طور پر صنعتی بے چینی پیدا کرتے ہیں تاکہ انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر مزدوروں کے لئے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کریں۔ ان میں کچھ لوگوں کو کمیونسٹ بتایا گیا ہے اور کچھ لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کا کوئی نظریہ نہیں ہے اور ہے بھی تو ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ باقی لوگوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال ہونے والے کرائے کے ایجنٹ کہا گیا ہے، ان لوگوں کے بارے میں سرکاری حلقوں کا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر مارکسی اصطلاح میں مزدور انقلاب کا ہلکا سا تصور بھی نہیں رکھتے۔

ڈھلمل یقین عناصر کی تخصیص اس طرح کی گئی ہے کہ کچھ افراد اور گروپ کسی نہ کسی وجہ سے حکومت کی پالیسی سے اختلاف رکھتے ہیں اور محض ہمدردی اور حمایت کے لئے بائیں بازو والے بن جاتے ہیں یہ عموماً وراثت سے محروم، ترسے ہوئے اور بے روزگار لوگ ہیں۔ ان میں اکثریت طلبہ، صحافیوں یا متوسط طبقے کے لوگوں کی ہے۔ یہ لوگ گڑبڑ پھیلانے اور امن و امان کو تہہ و بالا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں سرکاری حلقے یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ لوگ پاکستان میں کمیونسٹ ملکوں کے سفارت خانوں کی مدد سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل مواقع تلاش کریں گے۔

(۱) موجودہ سیاسی اور اقتصادی صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش۔

(۲) رائے عامہ کا اعتماد رکھنے والے لیڈروں کو متاثر کرنا۔

(۳) مزدوروں کی ہڑتالوں اور غیر قانونی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی۔

(۴) تمام بائیں بازو کے افراد اور تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔

(۵) بائیں بازو کے ذرائع ابلاغ سے روابط پیدا کرنا۔

(۶) کمیونسٹ اور حکومت کے خلاف پبلسٹی کے مواد کو خصوصاً طلبہ میں پھیلانا۔

(۷) مسٹر بھٹو کی رہائی کے مطالبے کی بھرپور حمایت کرنا۔

(۸) لوگوں کو قانون شکنی پر ابھارنا۔

بتایا جاتا ہے کہ بائیں بازو والوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ کٹر روس نواز اور چین نواز کمیونسٹوں کے اختلاف سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے پوری منصوبہ بندی اور باہمی تعاون سے کوششیں کی جائیں اور اس کے ساتھ جو لوگ ٹریڈ یونینوں سے باقاعدہ منسلک نہیں ہیں انہیں استعمال کیا جائے اور اس طرح حکومت سے اختلاف رائے رکھنے والے لوگوں کو بائیں بازو والوں کے اثر سے نکالا جائے۔

باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ اس ضمن میں حسب ذیل فوری اقدامات تجویز کئے گئے ہیں۔

(۱) صنعتی مزدوروں، طلبہ، صحافیوں اور دانشوروں میں موجود بائیں بازو والوں اور خصوصاً روس نوازوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

(۲) حکومت کے خلاف مزدوروں، طلبہ اور صحافیوں کا مشترکہ محاذ کسی قیمت پر قائم نہ ہونے دیا جائے۔

(۳) مزدوروں کے مسائل پر فوری توجہ دی جائے۔

(۴) مزدور طبقے کے اس تاثر کو ختم کیا جائے کہ مارشل لاء حکومت کا صنعتی انتظامیہ اور دائیں بازو کے مزدور لیڈروں کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔

(۵) جہاں تک ممکن ہو مزدور لیڈروں کی گرفتاری اور نظربندی سے اجتناب کیا جائے اور پولیس کو متنبہ کر دیا جائے کہ وہ مزدوروں اور انتظامیہ کے جھگڑوں میں ملوث نہ ہو۔

(۶) انٹیلی جنس والے مزدور تنظیموں میں گھس جائیں اور بائیں بازو کے مزدوروں کا اعتماد حاصل کر کے ان سے معلومات لیں۔

(۷) پاکستان میں کمیونسٹ ملکوں کے سفارت خانوں کی طرف سے مہیا کئے جانے والے کمیونسٹ لٹریچر کو پھیلنے سے روکا جائے اور مقامی طور پر چھپنے یا تجارتی مقاصد سے درآمد کئے جانے والے لٹریچر کی انٹیلی جنس ایجنسیاں چھان بین کریں۔

(۸) روسی اور دوسرے کمیونسٹ سفارت خانوں اور ان کے علاوہ افغانستان کے سفارت خانے میں آمد و رفت پر کڑی نظر رکھی جائے۔

(۹) بڑے بڑے شہروں میں سیاسی، دانشور اور صحافتی حلقوں میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے انقلابی کمیٹیاں قائم کرنے کے روسی منصوبے کو متعلقہ افراد کی شناخت کر کے ختم کر دیا جائے اور ان افراد کے خلاف مروجہ قوانین کے تحت کارروائی کی جائے۔

مندرجہ بالا اقدامات کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ان کی کامیابی کا انحصار ان لوگوں کی اہلیت پر ہوگا، جو انہیں بروئے کار لائیں گے۔ اس ضمن میں نگرانی کی ڈیوٹی پر ان لوگوں کو لگانے سے احتراز کیا جائے جو عام طور پر مجرموں کی تلاش پر مامور کئے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے عناصر سے نمٹنے کے لئے خصوصی اہلیت رکھنے والے افراد کے انتخاب کی ہدایات دی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ ان کی اہلیت، ذہانت، تعلیمی پس منظر اور وسائل کا پہلے امتحان لیا جائے۔

کراچی کی چٹھی

آفت میں اقتدار کے لئے بھاگ دوڑ

سیلاب سے موہن جوداڑو کو بھی نقصان پہنچا ہے

پاکستان پر آفت آئی ہوئی ہے۔ بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے ایک طرف گاؤں کے گاؤں ڈوبے ہوئے ہیں تو دوسری طرف شہروں میں بھی تباہی کے المناک منظر نظر آرہے ہیں۔ مگر پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) جو بقول مولانا مفتی محمود پاکستان کی قوم کا اتحاد ہے قوم اور عوام پر نازل شدہ ان مصیبتوں اور تکلیفوں سے بے نیاز کبھی کراچی تو کبھی راولپنڈی میں حکومت میں شمولیت کے سلسلے میں "گفتگو"، "مذاکرات" اور عشائیوں میں مشغول ہے ایسی بھی کیا بے حسی! اگر پی این اے کے نزدیک حکومت میں شمولیت واقعی قوم کے عظیم تر مفاد میں ہے تو بھی کیا حکومت میں شمولیت کے سلسلے میں حکومت سے مذاکرات اس وقت تک ملتوی نہیں کئے جا سکتے تھے جب تک کہ سیلاب اور بارشوں کی زد میں آئے ہوئے شہروں اور دیہات میں زندگی کسی حد تک معمول پر نہیں آجاتی۔

بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے چاروں صوبوں میں کئی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ کئی گھرانے کھلے میدانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ گھروں کے ساتھ گھر کا سارا سامان پانی کی نذر ہو گیا ہے۔ نہ اوڑھنے کو ہے اور نہ کھانے کو۔ مختلف علاقوں سے موصول شدہ اطلاعات کے مطابق ان کا کوئی بھی پرسان حال نہیں ہے۔

سندھ میں سیلاب کی وجہ سے دادو کے کئی چھوٹے بڑے گاؤں اور لاڑکانہ کا کافی علاقہ پانی کے نیچے آگیا ہے۔ حتیٰ کہ لاڑکانہ کے نزدیک تاریخی اہمیت کے حامل موہن جوداڑو کے آثارِ قدیمہ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ یہاں کے مصیبت زدہ لوگوں کو امداد فراہم کرنے کے لئے برائے نام کارروائیاں کی جا رہی ہیں جن کا چارج بیوروکریسی کے حوالے کیا گیا ہے۔ لوگ سوچ رہے ہیں کہ جن کے خلاف آج کل وائٹ پیپر جاری کئے جا رہے ہیں۔ ان کے زمانے میں ڈپٹی کمشنر سے لے کر وزیراعظم تک ہر ذمہ دار شخص ان کے پاس پہنچتا تھا اور امدادی کارروائی کی اعلیٰ سطح پر نگرانی کی جاتی تھی۔ انہی دنوں میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق صاحب سندھ آئے ہوئے تھے شاید ان کی نظر مساوات کی اس خبر پر پڑ گئی کہ آج بھٹو ہوتا تو ضرور لطیف آباد آتا اور سیلاب سے متاثر علاقوں کے عوام سے ملاقات کرتا۔ جس کے بعد سی ایم ایل اے صاحب حیدرآباد پہنچے مگر دادو اور لاڑکانہ کے متاثرہ علاقوں کا معائنہ کرنے کا انہیں شاید پھر بھی وقت نہیں مل سکا۔

جہاں تک سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے تو کراچی اور حیدرآباد کے اندر ایک آدھ سیاسی جماعت کے رہنما پل وغیرہ پر جا کر فوٹو وغیرہ کھنچوا آئے مگر سندھ کے اندرونی علاقوں میں جانے کی کسی کو بھی توفیق نہیں ہوئی۔

دوسری طرف شہروں کی بھی انتہائی خستہ حالت ہو گئی ہے۔ فقط کراچی میں بھی شہر کی کوئی ایسی سڑک نہیں جو مکمل یا جزوی طور پر تباہ نہ ہو گئی ہو۔ آج کل کراچی کے راستوں پر گاڑیاں چلانا تو درکنار پیدل چلتے ہوئے بھی ڈر محسوس ہوتا ہے۔ کئی دنوں سے یہ حالت ہے مگر نہ کے ایم سی اور نہ پی ڈبلیو ڈی کے کانوں پر جوں تک رینگی ہے جو ان راستوں کی مرمت کرائے لوگوں کی تکلیفوں کا تھوڑا بہت ازالہ کرتے۔ باخبر ذرائع کے مطابق راستوں کی مرمت نہ ہونے کا سبب سرکار کے پاس پیسے کا نہ ہونا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ حکومت نے "ہینڈز اپ" کر لئے ہیں۔

ایسے وقت میں قومی محاذ آزادی کے رہنما جناب معراج محمد خان کی ایک آواز بلند ہوئی ہے۔ انہوں نے کراچی کے راستوں کی خستہ حالی اور صفائی کے عام انتظام کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا ہے کہ اگر اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا تو ہم خود یہ کام کریں گے اور یہ بلے لگا کر صفائی وغیرہ کریں گے کہ NO SERVICE NO TAX (خدمت نہیں تو ٹیکس نہیں) مگر ایسے لگتا ہے کہ حکومت پر اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے اور مجبور ہو کر کراچی کے عوام کو خود ہی صفائی وغیرہ کرنی پڑے گی۔

لوگوں کی مصیبتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس وقت پاکستان قومی اتحاد کے سارے جغادری رہنما راولپنڈی منتقل ہو چکے ہیں۔ پنڈی سے آنے والی اطلاعات کے مطابق اس وقت پیر پگارا زبردست فارم میں رہے۔ دوسری طرف شیرباز مزاری اجلاس چھوڑ کر لاہور آگئے ہیں۔ این ڈی پی کے ذرائع کے مطابق این ڈی پی کے مستقبل کے لائحہ عمل کا انحصار ۱۵-۱۶ اگست کو ہونے والے کنونشن پر ہے۔ این ڈی پی کے "عقاب" آج کل بڑے خوش نظر آرہے ہیں کہ اس کنونشن میں این ڈی پی کی "فاختاؤں" کو زبردست شکست دے دی جائے گی۔ یہ تو وقت ہی بتلائے گا کہ اس میں کتنی صداقت ہے۔ جب کہ فی الحال گذشتہ دنوں میں فاختائیں "عقابوں" کو دو شکستیں دے چکی ہیں۔ ایک شکست این ڈی پی کے سربراہ شیرباز مزاری کی طرف سے ایک پریس کانفرنس کے دوران افغانستان کی حکومت پر سخت نکتہ چینی ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ مزاری صاحب نے کہا تھا کہ "افغانستان کی موجودہ حکومت بھی پاکستان کی موجودہ حکومت کی طرح غیر نمائندہ ہے"۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ "افغانستان کی موجودہ حکومت خود کو مستحکم کرنے کیلئے "نئے مسائل" کھڑے کر رہی ہے"

(باقی صفحہ ۵ پر)

بلوچستان

یہاں مسلم لیگ نہیں ہے

صرف سرداروں کا اقرار، اقرار نامہ نہیں رہا

طاہر محمد خان

جنرل ضیا نے بلوچستان کا قدرے تفصیلی دورہ بہ انداز ذوالفقار علی بھٹو کیا اور مصروفیت کی نوعیت بھی کم و بیش وہی رہی۔ کیونکہ بیورو کریسی کو پورے پانچ برس تک ایسے دوروں اور ایسی ملاقاتوں کا پروگرام بنانے میں اب خاصی مہارت ہو گئی ہے۔ یوں تو سربراہانِ حکومت کے تمام دورے اہم ہوتے ہیں کیونکہ بڑے آدمی بھلا کبھی کوئی غیر اہم کام کر سکتے ہیں؟ لیکن جنرل صاحب کے اس دورے کو ملک میں اور ملک سے باہر بالخصوص بی بی سی نے بھی اہم کہا ہے اس لئے اس کو اہم کہنا پڑے گا۔ شاید اس لئے بھی کہ انتقال اقتدار کے کم از کم پندرہ مرحلوں میں سے دوسرے مرحلے کا دار و مدار بلوچستان کے لیڈروں سے کسی تصفیے پر بھی ہے۔ کیونکہ اس تصفیے کے نتیجے میں مرکزی کابینہ کا فالو اپ ایکشن ہونا ہے۔ اور صوبائی حکومتوں نے قائم ہونا ہے یہ کام ویسے تو بڑا آسان رہتا۔ لیکن یہاں مسلم لیگ نہیں ہے۔ ایک بیچارے حاجی محمد مراد جمالی تھے وہ بھی اخباری اطلاعات کے مطابق "ظالم حسنوں" کے ہاتھوں جامِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اب تاج محمد جمالی نے شمولیت کا اعلان کیا ہے۔ لیکن پھر بھی مسلم لیگ ہر چند کہیں ہے نہیں ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ کہ موجودہ عبوری انتظامیہ نے اب تک مسلم لیگ کو یہاں کی جماعت ماننے سے پہلو تہی کی ہے۔ مرحوم جمالی ہر چند یہ تاثر دیتے رہے کہ مذاکرات ہوتے رہیں لیکن حکومت تو مسلم لیگ نے بنانی ہے لیکن سر سنڈیمن کے ہاتھوں لگے ہوتے ملکوں اور سرداروں کی فصل کو تو جب تک ڈپٹی کمشنر اور پولیٹیکل ایجنٹ نہ بتائے اس وقت تک وہ اپنوں میں سے کسی کی بات کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ اب سے پہلے کبھی جمالیوں نے بھی ڈپٹی کمشنر کے علاوہ کسی کی بات پر عمل نہیں کیا تھا تو بھلا حاجی مراد خان کی بات کیسے چل سکتی تھی۔

فارورڈ پالیسی کے موجد سر رابرٹ سنڈیمن اور فارورڈ پالیسی نامی کتاب کے مصنف رچرڈ اسحاق بروس نے جب مل کر بلوچستان کو فتح کیا تو یہاں ان کی مڈبھیڑ تین قوموں سے ہوئی۔ بلوچ۔ براہوئی اور پشتون۔ چنانچہ وہ بلوچستان کے بارے میں جب بھی کوئی بات کرتے تو ان تین فریقوں کو ذہن میں رکھتے تھے اور کوئی بات تینوں فریقوں سے منوا لیتے تو وہ بات گویا مسئلے کا مکمل حل قرار پاتی۔ لیکن ۱۸۷۶ء اور ۱۹۷۸ء کے بلوچستان میں بعض بنیادی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اب ان تین قومی گروپوں کے علاوہ بعض دوسرے پریشر گروپ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی حیثیت کو ماننا اب مجبوری قرار پاتا ہے۔ ان میں سے پنجابی مہاجر آبادکار ہزارہ اور افغانستان سے آئے ہوئے بعض قبائل۔ اور کچھی کی جاٹ اور جامورٹ آبادی (جو سر سنڈیمن کے زمانے میں براہوی حاکمین کے کھاتے میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن اب پٹ فیڈر میں بے پناہ خون بہا کر ان محنت کش کسانوں نے اپنے وجود کا خاکہ بنایا۔ اور شاید منوایا بھی ہے) ایک تبدیلی اور بھی آئی ہے۔ کہ سنڈیمن کے وقت میں قبائلی کے سربراہوں کو اکائی مانا جاتا تھا۔ اب قبائل میں شعور کی جو لہر پیدا ہوئی ہے۔ اس کا بھی اصرار یہی ہے کہ سرداروں کا احترام ہزار بار۔ لیکن جن کا گھر لٹا۔ جن کا خون بہا اور جن کو نقصان ہوا ہے کبھی ان سے بھی تو پوچھا جائے جب نوروز خان شہید کی تحریک میں بلوچستان کے لوگ مرے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ تو فیض احمد فیض نے کہا تھا

کہیں نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں لہو کا نشان
نہ دستِ پنجۂ قاتل نہ ریگ صحرا پر

لیکن اب تو پورے بیس سال ہوئے کہ خون کے قطرے ڈھیر ہو رہے ہیں۔ اب اگر اسے ریگ صحرا چھپانا بھی چاہے تو دست و پنجۂ قاتل خود پکار اٹھے گا۔ تو اس لحاظ سے سنڈیمن سے جنرل ضیا تک ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ اب صرف سرداروں کا اقرار، اقرار نامہ نہیں ہے۔ بلوچستان میں اعتدال کے لئے عوام کا احترام بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے جنرل صاحب کے سامنے مدعیانِ اقتدار کے علاوہ مدعیانِ احترام بھی کھڑے ہیں پروگرام میں چونکہ صرف مدعیانِ اقتدار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے بات انہی تک محدود رکھتے ہیں۔

بلوچ اور براہوی اقوام کی سربراہی ایک یونٹ سے پہلے خان معظم بیگلر بیگی۔ خان آف قلات کیا کرتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے اپنے وقت میں مری بگٹی قبائل کو ان کے حلقۂ تصرف سے نکال دیا تھا۔ اس طرح عملاً وہ براہوی قبائل کی نمائندگی اور ریاستی مفادات کی وکالت کرتے تھے۔ بلوچستان میں سیاسی عمل نے بلوچ براہوی کو دوبارہ ایک لڑی میں پرو دیا۔ لیکن یہ نمائندگی خان کے ہاتھوں سے نکل کر مینگل اور مری سرداروں کے پاس آئی۔ ان سرداروں کا رویہ درست ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ متبادل انتظام کی صورت میں ایک "وفادار نامی" سرداروں کا گروہ بھی ہر وقت تیار رکھا جاتا تھا۔ تاکہ جب خود سر سرداروں سے بات نہ بنے تو "وفادار" سردار بلوچستان کے نام پر

حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہیں۔ لیکن عجیب المیہ ہے کہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۸ء تک مسلسل "خودسر سرداروں" سے بات چیت اور تصفیئے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں اور اس صورتِ حال میں بھی اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ البتہ آج "خودسر" گروہ کے سربراہوں کو برملا کچھ نہیں کہا جاتا۔ ہاں اُن کی نقل و حرکت پہ آج بھی اُتنی ہی کڑی نگرانی ہے۔ جو پہلے تھی۔ ساتھ ہی محبِّ وطن اور "وفادار" سرداروں کے گروہ کی صف بندی کا اُسی انداز پر اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ جو پہلے ہوتا رہا ہے۔ تاکہ بصورت ناکامی قبائلی نمائندگی اپنے پورے احتشام کے ساتھ ہو سکے۔

اس پسِ منظر میں مدعیانِ اقتدار کے دو گروہ تیار بیٹھے ہیں۔ ایک گروہ جس کو ماضی میں "علیحدگی پسند، قوم پرست اور بعض اوقات غیر ملکی مفادات کا نگران قرار دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن تا تصفیہ مذاکرات ان القاب کے استعمال کی ممانعت ہے۔ یہ گروہ مستفیض ہو رہا ہے دوسرا گروہ جواب بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد نے پاکستان کے قیام اور دوام کے لیے قربانیاں دی ہیں لیکن آج ان کو نظر انداز کر کے "خودسر" عناصر کو اُچھالا جا رہا ہے۔ ان کو یہ دھکیشن دی جا رہی ہے اور ساتھ ہی یہ لوگ یہ دھمکی بھی دے رہے ہیں کہ پھر جب حالات ہاتھ سے نکل جائیں۔ تو صوبے کو سنبھالنا ہمارے بس کی بات نہیں ہوگی۔ یہاں کی بیوروکریسی اب تک بزورِ دریا بہ زاری ان لوگوں کو ہمراہ رکھنے اور گمراہ ہونے سے بچانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ ان میں سے ایک سب سے بڑے "محبِ وطن" نبی بخش زہری، دل برداشتہ ہو گئے ہیں انہوں نے مزید ان معاملات میں ملوث ہونے سے توبہ کر لی ہے۔ البتہ یہ کہا ہے کہ وہ اس بات کے لئے دُعا کرتے رہیں گے۔ کہ مسلم لیگ دوبارہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لے اور ملک کو مصیبتوں کے نرغے سے نکالے جب تک وہ یورپ کی سیر کر آتے ہیں۔

مدعیانِ اقتدار کے یہ گروہ پھر مزید دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ بلوچ مجاہدینِ جمہوریت۔ اور پشتون مجاہدین جمہوریت۔ بلوچ محبِّ وطن سیاستدان اور پشتون محبِ وطن سیاستدان۔ اس مزید تقسیم میں جمہوریت پسند بلوچ مجاہدین میں سابق نیپ اور حال این ڈی پی کے کارکن اور لیڈر ہیں اور پشتونوں میں ایسی قربانیوں کی دعوے دار نیپ پشتو نخواہ ہے جب کہ دوسرے گروہ میں سرداروں، سردار زادوں نئے سرداروں، سرمایہ داروں اور نئے سرمایہ داروں کا قافلہ بے مہار ہے۔

بلوچستان کے موجودہ مذاکرات میں مارشل لاء انتظامیہ صرف بلوچ سرداروں کو سیاسی اہمیت دے رہی ہے۔ اس میں بھی کالعدم نیپ کے لیڈروں کو۔ اس پالیسی نے ایک تو پشتون لیڈروں کو ناراض کیا ہے۔ کیونکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ بلوچستان میں ایک سیاسی فریق بلوچستان کے پشتون بھی ہیں۔ لیکن ان کو نہ صرف پوچھا نہیں جاتا۔ بلکہ ان کے "جیب میں ہونے کا تاثر دیا جاتا ہے۔ جنرل صاحب کے اس دورے میں یہ ناراضگی ذرا زیادہ کھل کر سامنے آئی۔ جیب میں ہونے پہ فخر کرنے والے حضرات بھی یہ تاثر دیتے رہے کہ یہ بڑی زیادتی ہے جب کہ ایک بائیکاٹ کی فضا بنی ہوئی تھی۔ لیکن آخری وقت میں لیپا پوتی کی ناکام کوشش کی گئی۔ کہ جس کا کوئی سیاسی نتیجہ نہیں نکلا جب کہ دوسری طرف وہ "وفادار" بلوچ سردار بھی اس مرتبہ ناراض نظر آئے۔ جو

نیپ کے سرداروں کی سربراہی کو قبول نہیں کرتے اور اپنے قبائلی مقام کو اُن سے زیادہ اُونچا قرار دیتے ہیں۔ ان میں دودا خان زرک زئی تو ہمیشہ ایسی قیادت کے دعویدار رہے ہیں۔ اس مرتبہ سر سرداران ساراوان نواب رئیسانی بھی تازہ دم ہونے کے بعد اس قیادت کے لئے دعویدار نظر آتے۔ جب کہ انتظامیہ نے ان سب کی ٹھوک میں رونمائی کرنا چاہی جس پہ تاثر یہ ہے کہ دودا خان نے ایسی پوزیشن ملنے سے انکار کر دیا۔

کالعدم نیپ کے لیڈروں کی ملاقات کو خوشگوار قرار نہیں دیا جا رہا ہے کیونکہ ان کے قریبی حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ایک طرف حکومت ہم سے بات کر رہی ہے جب کہ دوسری طرف موقعہ پرست افراد کو اپنے گرد جمع کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیک نیتی کی دلیل نہیں۔ بلکہ حکومت ہمیں مذاکرات میں مصروف رکھ کر زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تصفیہ طلب معاملات میں بھی حکومت کی پالیسی غیر معیّن اور گومگو کی غمازی کرتی ہے۔ کالعدم نیپ کے سردار اُس رقم کو جو حکومت ادا کرنے پر آمادہ ہو رہی ہے "تاوان (بھائی تاوان جنگ) کہنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس سے اُن کی ایک آزادانہ حیثیت قرار پاتی ہے۔ جب کہ انتظامیہ اور فوجی حکومت اس اصطلاح کے استعمال سے گریز کر رہی ہے۔ کیونکہ ایسی اصطلاحات دو آزاد فریقوں کے درمیان استعمال ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ حکومت ایسی ادائیگیوں کو امداد اور بحالی کا نام دینا چاہتی ہے یہ باتیں بڑی بنیادی ہیں۔ ان کا تصفیہ مشکل ہے۔

دونوں فریق وقت کو طول دے رہے ہیں مارشل لاء انتظامیہ کا خیال ہے کہ اگر باقی ملک پر گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ تو بلوچستان کوئی نمایاں مسئلہ نہیں رہتا ہے جب کہ دوسرا فریق ابھی طویل جدوجہد کے بعد نہ صرف ذرا توقف کرنا چاہتا ہے بلکہ سوچنے کے لئے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے سیاسی مہلت چاہتا ہے۔ پھر افغانستان میں مستقبل کے حالات کا بلوچستان کی سیاسی صورتِ حال پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اس لئے بھی بلوچ لیڈر عجلت سے کام لینا نہیں چاہتے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات بلوچ لیڈروں کا اندازِ سیاست ہے کہ جس میں وسائل کو مجتمع کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ وہ اس وقت کو اس مقصد کے لئے بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

بلوچستان کے مذاکرات پی این اے سے لازماً مختلف ہیں کیونکہ پی این اے کے سیاسی عناصر ہر دور میں سیاسی یتیم رہے ہیں۔ اور جب بھی کسی حکومت نے ان کی سرپرستی قبول کی ہے۔ تو یہ لوگ تمام اصولوں اور سیاسی معاملوں کو بھول کر حکومت کی جھولی میں گئے ہیں لیکن بلوچ لیڈر عادتاً اپنی اتنی ہلکی قیمت رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پھر اب ایک بڑا طاقت ور پریشر گروپ ان کی صفوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ جو سربراہوں کو مَن مانی کرنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ان حالات میں واقعتاً بلوچستان کے مذاکرات اہمیت اختیار کرتے ہیں اور فیصلے دوررس نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جن کا اس مرتبہ پاکستان کی تاریخ پر بڑا واضح اثر ہوگا۔

فوجی کابینہ کے
وزیر جنرل حبیب اللہ
کی کہانی
بابا عظیم گل ڈرائیور
کی زبانی

محمد شاہد مجید

حبیب اللہ کے والد انگریز جاسوس کرنل لارنس کے دستِ راست تھے

غازی امان اللہ کی جاسوسی کا صلہ وزارت، جاگیر اور فوج میں کمیشن

بابا عظیم گل کوہاٹ کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں وہ ڈرائیور تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ انگریز افسروں کے ساتھ ملازمت میں بسر ہوا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں نے زمانے کے بہت سرد گرم دیکھے ہیں۔ ان کی زندگی ہماری قومی اور سیاسی تاریخ کا ایک بن لکھا باب ہے۔ آج کی صحبت میں اس بن لکھی تاریخ کے چند اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کا تعلق لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ سے ہے جبیب اللہ جو سرحد کے ایک بڑے جاگیر دار اور ملک کے بڑے سرمایہ دار ہیں۔ ان کا شمار ان بائیس ۲۲ خاندانوں میں ہوتا ہے جن کا پاکستان کی قومی دولت پر قبضہ ہے۔ وہ سابق صدر ایوب خان کے سمدھی ہیں۔ علی قلی خان کے فرزند ہیں۔ یہ وہی علی قلی خاں ہیں جن کا ذکر انگریز تذکرہ نگاروں نے تاجِ برطانیہ کے فرزندانِ دِل پسند کے ذیل میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

جنرل حبیب اللہ فوج سے نکلے تو ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑے صنعت کار بن گئے۔ دولت ان کے قدم چومنے لگی۔ لیکن یہ راز آج تک افشاء نہ ہوا۔ لیکن باخبر ذرائع بتاتے ہیں کہ ایوب خان توپ پر سوار ہو کر ملک کے اقتدار پر تو قابض ہو گیا مگر وہ جن جرنلوں کے سہارے برسرِ اقتدار آیا تھا، اُن سے خائف بھی تھا۔ اُسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس کا تختہ نہ اُلٹ دیں۔ کیونکہ بقول جنرل عتیق الرحمٰن" فوجی افسروں میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اُن کا ایک ساتھی صدرِ مملکت بن سکتا ہے۔ تو وہ کیوں نہیں بن سکتے"۔ چنانچہ صدارت کے متوقع امیدوار جرنلوں میں سے کچھ کو ایوب خاں نے وزیر بنایا۔ بعض کو سفیر نامزد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایوب خان نے جنرل حبیب اللہ سے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟" حبیب اللہ نے ایوب خان کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کرسی"۔ ایوب خان نے کرسی تو نہ دی۔ البتہ اُن کا منہ بند کرنے کے لئے جنرل موٹرز کے مالکان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی فیکٹری جبیب اللہ کو فروخت کر دیں چنانچہ حبیب اللہ جنرل موٹرز کے مالک بن گئے اور انہوں نے اس کا نام تبدیل کر کے گندھارا رکھ دیا پیش بندی کے طور پر ایوب خان نے اپنے بیٹے گوہر ایوب کی شادی حبیب اللہ کی بیٹی سے کروا دی۔ جنرل حبیب اللہ چور دروازے سے صنعت کار بنے تو حبیب جالبؔ نے کہا۔

ادھر بھی بھائی اُدھر بھی بھائی
بیچوں بیچ ہے گندھارا
پو بارہ
مسند پہ وہ بیٹھے ہیں جو پھرتے تھے کل آوارہ
پو بارہ

شاید یہ درست بھی ہے لیکن اس کا سبب اور بھی ہے اور وہ ہے ان کا خاندانی پس منظر۔ بابا عظیم گل نے اسی پر سے پردہ اٹھایا ہے انہوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہی بتایا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک ملاقات میں میں نے بابا عظیم گل سے باتوں باتوں میں پوچھا "بابا آپ جنرل حبیب اللہ کو تو جانتے ہی ہیں۔ ان کے بھائی یوسف خٹک کو بھی جانتے ہیں" انہوں نے مجھے اپنا جملہ پورا بھی نہ کرنے دیا۔ بیچ میں بول پڑے "میں اُن کے باپ علی قلی خان کو بھی جانتا ہوں۔ ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا غالباً ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں خیبر کے پولیٹیکل ایجنٹ ایڈورڈ صاحب کا ڈرائیور تھا۔ ایک دن ایڈورڈ صاحب جو بڑی روانی سے پشتو بولتے تھے۔ دفتر میں بیٹھے تھے، سڑک کے دوسری طرف ایک فقیر آکر بیٹھا۔ نورانی چہرہ، لمبی داڑھی، سرخ سپید رنگ بہت سے لوگ اس سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ مجھے ایڈورڈ صاحب نے اُس کے پاس بھیجا کہ اُسے صاحب کی طرف سے چائے کی دعوت دوں۔ بقول ان کے وہ بھی اس سے فیض حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے پشتو زبان میں اس فقیر کو صاحب کی طرف سے چائے کی دعوت دی۔ اس نے پشتو میں جواب دیا کہ "تمہارا صاحب انگریز ہے، کافر ہے۔ میں اس کے ساتھ چائے نہیں پی سکتا"۔ لیکن بڑی مشکل سے میں نے اُسے منت سماجت کر کے راضی کیا اور صاحب کے پاس لے آیا۔ چائے پینے کے بعد صاحب نے کہا کہ جاؤ فقیر بابا کو سرحد پہ چھوڑ آؤ۔ یہ کابل جانا چاہتے ہیں اور یوں فقیر بابا کابل چلے گئے۔ کافی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ وہ پیر بابا آج کل ملا شور بازار کابل میں امامت کے فرائض انجام دیتا ہے اور اُس کے مریدوں کا حلقہ خاصا پھیل چکا ہے"۔

"۳۲ء کا ذکر ہے۔ کابل میں گڑبڑ کے بعد شاہ امان اللہ کو تخت چھوڑنا پڑا۔ ایک دن ایڈورڈ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ موٹر لے کر طورخم جاؤ ان پیر بابا کے آنے کی خبر ملی ہے۔ انہیں لے آؤ۔ میں گاڑی لے کر گیا اور انہیں صاحب کے بنگلے پہ لے آیا۔ دو دن بعد صاحب مجھ سے کہنے لگے ایک اور صاحب آئے ہیں انہیں گورنمنٹ ہاؤس لے جانا ہے۔ دوسرے دن جب میں نے اس

اجنبی صاحب کو گاڑی میں بیٹھایا تو مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ اب جو غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوں تو وہی فقیر بابا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ داڑھی مونچھیں صاف تھیں اور کوٹ پتلون میں ملبوس تھا۔ میں نے فقیر بابا سے جو اب صاحب بن چکا تھا پوچھا کہ "پیر بابا کل جب میں تمہیں طورخم سے لایا تو تمہاری صورت کچھ اور تھی۔ یہ ایک دو روز میں تم نے کیا کر دیا۔" وہ لہجہ بدل کر بولا۔ "WHAT" (کیا؟) میں نے کہا "اب تم WHAT، WHAT بولتے ہو کل خوب پشتو میں بولتے تھے مجھے دھوکہ نہ دو۔ میری نظریں ابھی اس قدر کمزور نہیں ہوئیں کہ تمہاری آنکھیں بھی پہچان نہ سکوں۔"

اس پر وہ فوراً پشتو میں بولا۔ "تم مسلمان ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

کہنے لگا۔ کلمہ پڑھو۔"

"میں نے کلمہ پڑھا تو کہنے لگا تم نے غلط پڑھا ہے۔ محمدؐ کو زبر سے نہیں پیش سے پڑھتے ہیں۔"

"بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص پیر بابا نہیں بلکہ کرنل لارنس تھا۔ دراصل اس کرنل کو ایک گہری سازش کے تحت کابل بھیجا گیا تھا کہ عوام میں شاہ امان اللہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرے۔ اُس نے وہاں امامت شروع کی ایک اور انگریز میجر عمرا ٥ ٧ اور شیخ محبوب علی جنہیں بعد میں نواب بنایا گیا۔ ان کی خفیہ معاونت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ شاہ امان اللہ نے غالباً ۱۹۳۴ء میں دہلی کے ایک جلسہ عام میں اعلان کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرا کے دم لیں گے۔" بابا نے بتایا کہ وہ اگرچہ مغربی تہذیب کے حامی تھے لیکن انگریزی سامراج کے سخت خلاف تھے اور غالباً اسی وجہ سے علامہ اقبالؒ اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے ان کے خلاف سازش تیار کی۔ کرنل لارنس کو پیر اور عالم دین بنا کر کابل بھیجا گیا۔ اسے عالم دین انگریزوں نے اس لئے بنایا تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا تھا۔

بابا عظیم گل نے مزید بتایا کہ "جب کرنل لارنس کابل میں مقیم تھا۔ اسی دوران ہندوستان کی بارڈر فورسز اور افغانی فوج کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں نے رات کے دس بجے فائر بندی کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی اطلاع دن ہی میں کرنل لارنس کو پہنچا دی، جو کابل کے مسلمانوں میں عالم دین سمجھا جاتا تھا۔ جب لارنس کو یہ خبر مل گئی تو اس نے کابل میں اپنے مریدوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ وہ محاذ جنگ پہ جا کر ایک چٹکی خاک کی اٹھا کر دشمن کی جانب پھینکے گا اسی وقت جنگ بند ہو جائے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ کرنل لارنس عالم دین کے بہروپ میں محاذ کے قریب پہنچا۔ اس نے اپنے پروگرام کے مطابق بہت سے لوگوں کی موجودگی میں زمین پر سے مٹی اٹھائی اور ہوا میں اڑا دی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق یکایک دشمن کی طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ یہ وہی وقت تھا جو فائر بندی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

غرضیکہ اس قسم کے مختلف شعبدے دکھا کر جب کرنل لارنس نے عوام کو اپنے اعتماد میں لے لیا تو انگریزوں کے ایجنٹ شیخ محبوب علی نے کچھ انگریز عورتوں کی برہنہ تصاویر میں ملکہ ثریا کا چہرہ سجا دیا ان عورتوں کو ایک سوئمنگ پول میں نہاتے ہوتے دکھایا گیا تھا۔ اس قسم کی چند تصاویر کی نمائش پر لوگ مشتعل ہو گئے اور کرنل لارنس نے عالم دین کی حیثیت سے امان اللہ خان کے خلاف "کافراست" کا فتویٰ صادر کر دیا۔ انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پٹھو قبائلی سرداروں کو بچہ سقہ کی مدد کے لئے

علی قلی خان نے ملکہ افغانستان کی تصویریں لوگوں میں تقسیم کیں

بھیجا۔ جس کی حیثیت اس وقت محض ایک باغی ڈاکو کی تھی لیکن ابھی یہ ڈرامہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ نادر شاہ نے اسے ناکام بنا دیا۔"

تفصیل گو بہت دلچسپ تھی لیکن یہ میرے سوال کا جواب فراہم نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا میں نے دوبارہ یاد دلایا "بابا میں نے تو جنرل حبیب اللہ اور یوسف خٹک کے بارے میں پوچھا تھا۔"

بابا عظیم گل ہنس کر بولے۔ "بھئی یہی تو اصل قصہ ہے پہلے پوری بات تو سن لو۔ دراصل امان اللہ خان کے خلاف انگریزوں کی اس سازش میں حبیب اللہ اور یوسف خٹک کا باپ علی قلی خان کرنل لارنس کا دست راست تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک مرید کی طرح گیا تھا اور ہر وقت اس کے ساتھ اس طرح رہتا تھا۔ لوگوں سے مل کر اس کے لئے جاسوسی کرتا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق لوگوں میں امان اللہ خاں اور اُس کی ملکہ کے خلاف طرح طرح کی افواہیں پھیلاتا تھا۔ پروپیگنڈا کرتا تھا۔ سرحد کے بعض لوگوں کے پاس آج بھی ایسی تصویریں موجود ہیں جو اسی زمانے کی ہیں۔ ان میں کرنل لارنس کسی عالم کی طرح نظر آتا ہے اور علی قلی خان اس کی خدمت میں مؤدب بیٹھا دکھائی پڑتا ہے۔ غرضیکہ انگریزوں کے اس خطرناک مشن کی کامیابی میں علی قلی خان کا زبردست ہاتھ تھا۔ انگریز اس سے اس قدر خوش ہوئے کہ کابل سے واپسی پر انہوں نے علی خان کو لشادرمین وزیر بنا دیا بہت بڑی جاگیر دی۔ تم جانتے ہو جب انگریز کسی کو نواب بنا دیتے تھے تو اس کی نسلیں تک نواب اور جاگیردار بن جاتی تھیں۔ علی خان کی اسی خدمت کے سلسلے میں حبیب اللہ کو فوج میں کمیشن ملا۔ وہ جنرل بنا۔"

بابا عظیم کہنے لگا۔ "علی قلی کیا تھا؟ کوئی اس کا نام بھی نہ جانتا تھا بہت معمولی آدمی تھا۔ انگریز کا خوشامدی تھا اور پٹھانوں کا دشمن تھا۔ جب وہ وزیر بن گیا تب بھی لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ انگریز کا پٹھو کہتے تھے مگر ظلم تو یہ ہے کہ پاکستان بنا تب بھی انگریز کا پٹھو اور ان کی اولاد حاکم رہی۔ آج یہ ہمارے ضلع کا سب سے بڑا خاندان کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کے گھروں میں آج بھی انگریز افسروں کی تصویریں لگی ہیں۔ یہ اُن تصویروں کو پھولوں کے ہار پہناتے ہیں۔ یہ انگریزوں کی دوستی پہ فخر کرتے ہیں۔"

بابا عظیم گل نے کہا۔ "بھٹو نے برسر اقتدار آتے ہی سرمایہ دار جاگیردار حبیب اللہ کو گرفتار کیا۔ حبیب اللہ کے بھائی اسلم خٹک اور یوسف خٹک بھٹو کے قدموں پر گر پڑے۔ حبیب اللہ اور اس کے بھائیوں نے وفاداری کی قسمیں کھائیں۔ امریکہ نے بھی دباؤ ڈالا۔ برطانیہ نے بھی احتجاج کیا۔ چنانچہ حبیب اللہ کو رہا کر دیا گیا۔ یہ کہتے کہتے بابا عظیم گل کا چہرہ اداس ہو گیا۔ اُس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "اسلامی نظام کی علمبردار حکومت نے حبیب اللہ کو وزیر بنا دیا ہے۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتی کہ حبیب اللہ اور اس کا خاندان سرحد کے پٹھانوں کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ غدار ہیں۔ اور انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔"

"میں خاموش رہا۔ کیا جواب دیتا۔ ویسے میرے پاس جواب تھا بھی کیا۔؟

شاہد

چوہدری ظہور الٰہی

پیدل سپاہی سے مارشل لاء وزیر تک

چودھری ظہور الٰہی لوگوں کی لاشوں سے گذرتے ہوئے ایوانِ اقتدار میں داخل ہو چکے ہیں، انہوں نے "تحریک نظامِ مصطفےٰؐ" اور اتحاد کے رہنماؤں کے ڈنر اور لنچ پر جو بھاری رقمیں خرچ کی تھیں۔ ان کی قیمت وصول کرنے کا ان کے پاس یہی ایک نسخہ تھا۔ اس سے زیادہ ان سے توقع کی بھی نہیں جا سکتی۔ لیکن جب انہوں نے اس "کمائی" کو صحافیوں اور پریس کارکنوں کے حلق پر چھری پھیر کر حلال کرنے کی کوشش کی تو ہمارا چپ رہنا مشکل ہو گیا۔ موصوف نے منہاج برنا اور ان کے ساتھیوں کو "بلیک میلر" اور "غنڈہ عناصر" قرار دے کر چاند پر تھوکنا چاہا ہے اس چھونک میں منہاج برنا اور اخباری صنعت کے کارکنوں کا تو کچھ نہیں بگڑا، البتہ انہوں نے اپنے چہرے پر پڑی ہوئی وہ نقاب نوچ پھینکی، جس کے پیچھے ان کا داغدار چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ کون ہیں، کیا ہیں۔ ماضی میں کیا کرتے رہے ہیں۔ اس سے تقریباً پاکستان کا ہر باشعور شہری واقف ہے۔ یہ مضمون ان کے گھناؤنے کردار کو مزید بےنقاب کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ اگر انہوں نے وزارت کے زعم میں پھر بھی زبان درازی کی تو ان کے ایک سال کے "اسلامی کارناموں" کے ساتھ دیلیج کراچی کی داستانیں بھی منظرِ عام پر آ سکتی ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے اس جیسا کردار بھی پیدا کریں۔

ایوب خان نے انہیں کمالیہ ٹیکسٹائل ملز بخش دی!

چوہدری ظہور الٰہی مارشل لاء کے وزیر ہیں، قومی اتحاد کے نفسِ ناطقہ ہیں۔ کونسل مسلم لیگ کے ممتاز رہنما ہیں۔ اسلام پسندی کے علمبردار اور جمہوریت کے چیمپئن ہیں۔ سوشلزم کے سخت مخالف ہیں۔ جگہ جگہ ان کے کارخانے ہیں۔ جگہ جگہ پر فیکٹریاں چلتی ہیں۔ جائداد اور املاک قطار اندر قطار رکھتے ہیں سرمایہ دار بھی ہیں اور سیاست دان بھی ہیں۔ کانسٹیبل سے کروڑ پتی بننے کا نسخۂ کیمیا بھی جانتے ہیں۔ غرض یہ کہ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔

ان کی زندگی بڑی پہلو دار ہے۔ اس میں چور دروازے ہی چور دروازے ہیں۔ صدر دروازہ کوئی نہیں۔ انہوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ پھر اس جھنجھٹ میں نہ پڑے۔ پلٹ کر اسکول کا پھاٹک دوبارہ نہ دیکھا۔ ۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا مگر نتیجہ کیا نکلا کسی کو معلوم نہیں۔ یہ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ لمبے چوڑے اور ہٹے کٹے تھے، پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہو گئے۔ ساہیوال میں تعینات ہوتے

چوہدری ظہور الٰہی کو "خدمات" کے صلے میں شراب تیار کرنے والی فیکٹری کے حصص دیئے گئے

چھ سال تک کانسٹیبلی کرتے رہے - ۴۲ء میں ترقی ملی - اور گوجرانوالہ میں ہیڈ کانسٹیبل مقرر ہوئے - مگر کچھ ہی عرصے بعد بدعنوانی اور فرض ناشناسی کے باعث تنزلی ہوئی پھر کانسٹیبل کے کانسٹیبل ہی رہ گئے -

۱۹۴۴ء میں چوہدری ظہور الٰہی کانسٹیبلی سے علیحدہ ہو گئے - کیوں ہوئے، کیسے ہوئے؟ یہ علیحدہ داستان ہے ۱۹۴۵ء میں وہ وزیر آباد آ گئے اور ایک ٹمبر کمپنی میں قلیوں کے جمعدار لگ گئے - یہ محنت مشقت کا کام تھا، جوان کے بس کی بات نہ تھی - لہٰذا یہ ملازمت بھی جلد ہی چھوٹ گئی ان کے بڑے بھائی منظور الٰہی تھے جو امرتسر میں ایک ہندو سرمایہ دار کی ٹیکسٹائل مل میں سپروائزر تھے - انہوں نے ظہور الٰہی کو بھی اس کارخانے میں دھندے سے لگا دیا - اس نوکری میں محنت زیادہ نہ تھی - یعنی صرف مزدوروں میں سوت تقسیم کرنا پڑتا تھا

قیام پاکستان تک یہ معمولی مزدوری پر سوت بانٹنے کا کام کرتے رہے اور کسی نہ کسی طرح پیٹ پالتے رہے - پاکستان بنا تو یہ وطن واپس آ گئے - یہاں ان کی ملاقات اپنے ایک رشتہ دار سے ہوئی - جنہوں نے ان کی دست گیری کی

ٹرسٹ کی عمارت زرعی ترقیاتی کارپوریشن کو کرائے پر دے دی

یہ چوہدری عبدالغنی گھمن تھے - سنا ہے کہ یہ دودھ کا کاروبار کرتے تھے - ایک زمانے میں وہ دودھ کے بڑے بڑے ڈول سائیکل پر لٹکائے پھرتے تھے - پھر اللہ نے اس کاروبار میں اتنی برکت دی کہ گھمن سے چوہدری عبدالغنی گھمن بن گئے دولت میں کھیلنے لگے - دولت آئی تو انہوں نے پر پرزے نکالے - سیاست میں داخل ہوئے اور فٹافٹ ترقی کے تمام مراحل طے کرتے چلے گئے - حتیٰ کہ ریپبلکن پارٹی کے دور حکومت میں صوبائی وزیر بن گئے -

چوہدری عبدالغنی گھمن کے دن پھرے تو ظہور الٰہی کی زندگی نے بھی پلٹا کھایا - انہوں نے ظہور الٰہی کو پاور لوم میں لگوا دیا - کہا جاتا ہے کہ اس کاروبار کے ذریعے انہوں نے دبا کے سوت کی چور بازاری کی، اور خوب خوب کمایا - اس کارگزاری پر چوہدری عبدالغنی گھمن بہت خوش ہوئے چنانچہ انہوں نے اپنی وزارت سے ظہور الٰہی کو بھی فیض پہنچایا - میلا رام ملز ان کے نام الاٹ کروا دی - ظہور الٰہی مہاجر تھے، نہ متروکہ جائداد پر ان کا حق تھا - بہتی گنگا تھی، انہوں نے بھی ہاتھ دھو لئے -

روایت مشہور ہے کہ میلا رام ملز کے الاٹمنٹ سے پہلے انہوں نے ایک اور دھندا شروع کیا تھا - اس کاروبار میں ان کے شرکت دار چوہدری محمد شفیع سماں تھے - دونوں رات کی تاریکی میں واہگہ کے راستے کپڑا اسمگل کرنے کا دھندا کرتے تھے - اسمگلروں میں موصوف جھوٹے والا کہلاتے تھے - وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ ٹیلے پر کھڑے ہو کر لائن کلیئر ہونے کا سگنل دیا کرتے تھے - غرضیکہ دولت پیدا کرنے کا جو موقع انہیں ملا، اسے ہاتھ سے جانے نہ دیا - روپیہ پاس آیا تو انہوں نے کاروبار کا جال اور پھیلایا ۱۹۵۶ء میں جہلم، سیالکوٹ ٹرانسپورٹ اور کارروان ٹرانسپورٹ کے نام سے دو کمپنیاں قائم کیں - اس میں کنبے

چوہدری ظہور الٰہی کو وزارت سے برطرف کیا جائے، یوسف قریشی

پاکستان پروگریسو لیبر آرگنائزیشن کا ایک اجلاس زیر صدارت جناب محمد درباب یوسف قریشی منعقد ہوا - اجلاس میں واپڈا لیبر یونین کے چودھری بشیر آل پنجاب فلور ملز ورکرز فیڈریشن کے صدر مرزا انور بیگ، آل پاکستان گھی اینڈ آئل ملز ورکرز فیڈریشن کے صدر میاں الطاف، پیکو مزدور یونین کوٹ لکھپت کے خوشی محمد، ڈرائی کلینرز ورکرز فیڈریشن پنجاب کے صدر گلزار احمد، پاکستان میکانائیز کنسٹرکشن ایمپلائیز یونین کے صدر خواجہ اسماعیل، نیشنل ٹیوب ویل کنسٹرکشن ایمپلائیز یونین پاکستان کے سلیم حیدر اور دیگر مزدور رہنماؤں نے خطاب کیا -

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر جلسہ جناب محمد درباب یوسف قریشی نے کہا کہ محنت کشوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی بڑھے جاتے پر چھانٹیوں اور محنت کشوں کو عوامی حکومت کی جانب سے دی گئی مراعات سے محروم رکھنے پر ابھی ملک بھر کے مزدور رہنما احتجاج کر رہے تھے کہ ہم پر مزدور دشمن صنعت کار ظہور الٰہی کو وزیر محنت بنا کر ٹھونس دیا گیا ہے جناب ظہور الٰہی نے وزیر بنتے ہی بغیر مارشل لاء حکام کو پریشرائز کر کے قومیائے گئے اداروں کو دوبارہ نجی ملکیت میں دلوا دیا جس کے بعد سرمایہ داروں نے انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بناتے ہوئے ہزاروں محنت کشوں کو ملازمتوں سے نکال کر بے رحم زمانے کے حوالے کر دیا ایسے شخص کے وزیر بن جانے کے بعد مزدور طبقہ کیا توقع کر سکتا ہے جناب درباب قریشی نے مارشل لاء حکام سے مطالبہ کیا کہ وہ پاکستان کے محنت کشوں کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے مزدور دشمن صنعت کار ظہور الٰہی کو وزارت محنت سے فی الفور ہٹا دے جیسے حلقہ نمبر ۳ میں جناب بھٹو کے مقابلے میں لوگوں نے گندے انڈے اور ٹماٹر مار کر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا - جناب درباب قریشی نے کہا کہ ملک بھر کے محنت کش خصوصاً ہماری آرگنائزیشن سے ملحقہ یونینز و فیڈریشنز چوہدری ظہور الٰہی کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کرتی ہیں اور مطالبہ کرتی ہیں کہ اس صنعت کار کو وزارتِ محنت سے ہٹایا جائے -

اجلاس میں مشترکہ طور پر مندرجہ ذیل قراردادیں پاس کی گئیں -

یہ اجلاس کمر توڑ مہنگائی، چھانٹیوں اور بیدخلیوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے حکومت سے فوراً ۲۰۰ روپے فی مزدور تنخواہ میں اضافہ اور نکالے گئے مزدوروں کی فوری بحالی کا مطالبہ کرتا ہے -

یہ اجلاس منہاج برنا اور دیگر گرفتار صحافیوں مزدور رہنماؤں اور سیاسی کارکنوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کرتا ہے اور صحافیوں کو ان کی جدوجہد میں ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتا ہے -

یہ اجلاس پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ ظہور الٰہی جیسے مزدور دشمن صنعت کار کو فوراً وزارتِ محنت سے ہٹایا جائے -

یہ اجلاس ملک کے بہتر مفاد میں ۴ ماہ کے اندر اندر انتخابات کرانے کا مطالبہ کرتا ہے -

یہ اجلاس نجی ملکیت میں دیئے گئے اداروں کو دوبارہ قومیانے کا پرزور مطالبہ کرتا ہے -

اور برادری کے بھائی بھتیجوں کے حصے رکھے۔ اور عام حصہ داروں کے حصے عتر بود کر لئے۔

بتایا جاتا ہے کہ بعض مصلحتوں کے باعث جب اپنے نام الاٹمنٹ نہ ہو سکا تو منڈی بہاؤ الدین اور سرگودھا میں جاپان کاٹن فیکٹری اپنے قریبی رشتہ داروں کے نام سے الاٹ کرالی۔ اس دوران ان کے بارے میں ایک داستان اور سننے میں آئی۔ انہوں نے سنٹرل کوآپریٹو بنک، گجرات میں بنولہ رہن رکھوایا لیکن چند ہی روز بعد بنک کے چوکیداروں سے مل ملا کر راتوں رات اڑوا بھی لیا۔ یہ بنولہ چوہدری ظہور الٰہی اینڈ کمپنی کے نام سے رہن رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ فریب چھپ نہ سکا۔ راز طشت از بام ہوا۔ معاملہ پولیس تک پہنچا۔ کمپنی کے خلاف پرچہ کٹا۔ تفتیش شروع ہوئی اور ابھی تک ہو رہی ہے۔ لطف یہ کہ بنولہ رہن رکھ کر بنک سے جو قرض انہوں نے لیا تھا۔ اس کا ابھی تک پانچ لاکھ روپیہ واجب الادا ہے
۱۹۵۸ء تک ظہور الٰہی کا دھندا اسی طرح چلتا رہا۔

وہ دَور بھی عجیب دَور تھا۔ ملک میں سیاسی افراتفری تھی۔ وزارتیں اور اسمبلیاں بنتی تھیں، ٹوٹتی تھیں۔ محلاتی سازشوں کا دور دورہ تھا، جس کی سرکار دربار میں رسائی تھی، اس کے پوبارہ تھے۔ ظہور الٰہی اور ان کے قبیل کے لوگ عیش کرتے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور رہے تھے۔

جب ایوب خان نے مارشل لار لگا کر اقتدارِ مملکت پر قبضہ کیا اور دھڑا دھڑ مارشل لار قوانین لگا کر دہشت گردی پھیلائی، تو چوہدری ظہور الٰہی بھی دہشت زدہ ہوئے۔ مگر جلد ہی انہوں نے کسی چور دروازے سے ایوب خان تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کی خوشنودی کے لئے پی پی ایل (پروگریسو پیپرز لمیٹڈ) کے حصے خرید لئے اور اس کے مالک و مختار بن گئے۔ اس خوشنودی کا صلہ جلد ہی مل گیا۔ کمالیہ ٹیکسٹائل ملز ان کے نام الاٹ ہوا۔ یہ ایک غیر مسلم کی متروکہ جائداد تھی۔ یہ نہ مہاجر تھے، نہ مستحق مگر جو انہوں نے چاہا وہی ہوا۔

اس کارخانے کی ۵۲۴ کنال زمین میونسپل حدود میں واقع تھی ظہور الٰہی نے میونسپلٹی کے افسروں کو گانٹھا اور کچھ دے دلا کر اس زمین کی مالیت تین لاکھ نوے ہزار تین سو پچاس روپے مقرر کرالی۔ پھر اسے فرضی طور سے ۷ء۷ لاکھ روپے میں پی پی ایل (پروگریسو پیپرز لمیٹڈ) کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس وقت پی پی ایل کے مینیجنگ ڈائریکٹر چوہدری ظہور الٰہی تھے۔ ایک طرف وہ اس ادارے سے شائع ہونے والے ملک کے بڑے اخبارات "امروز" اور "پاکستان ٹائمز" سے اپنی تشہیر کراتے۔ قومی صحافت کی سرپرستی فرماتے اور دوسری طرف پس پردہ کاروباری دھاندلیوں میں اس کے ذریعے فائدہ اٹھاتے۔

چوہدری ظہور الٰہی کو کمالیہ ٹیکسٹائل ملز میں زیادہ بافت کی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے اس کی مشین اور دوسرا ساز و سامان رفتہ رفتہ فروخت کر ڈالا۔ جب صرف مل کی زمین باقی رہ گئی تو انہوں نے مالکان پر حکومت کا رعب گانٹھا ان دنوں وہ ایوب خان کے قریبی حاشیہ برداروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس طرح انہوں نے یہ زمین کوڑیوں کے مول خرید لی۔ جب زمین قبضے میں آ گئی تو انہوں نے اسے قطعات میں تبدیل کر دیا اور ان کی بھاری قیمت وصول کی۔ حالانکہ قانونی کے طور پر صنعتی علاقے کی زمین کو رہائشی قطعات بنانا سراسر دھاندلی تھی۔ قانون ان کے سامنے بے بس تھا۔

لیکن وہ لوگ جو ظہور الٰہی کے اس غیر قانونی اقدام سے متاثر ہوئے۔ وہ خاموش نہ رہے۔ انہوں ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ فریب جب منظرِ عام پر آیا تو ہر طرف اس کا چرچا ہوا۔ ظہور الٰہی نے گھبرا کر خریداروں سے زمین واپس لے لی۔ اب انہوں نے ایک نیا چکر چلایا۔ اس وسیع زمین کو ہاؤسنگ سوسائٹی میں تبدیل کر دیا اور اس کے نام پر مختلف پلاٹوں کو آٹھ سو روپے فی مرلہ کے حساب

چوھدری ظھور الٰھی

پرمٹوں اور قرضوں کی سیاست کے ماہر ہیں

چودھری ظہور الٰہی صاحب کی پوزیشن نیچے آ رہی ہے۔ بڑی وجہ تو یہی ہے کہ عوام ان کے ظلم و ستم سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے ان سرمایہ داروں کا کردار ہے وہ نو دولتیوں کی ستم رانیوں سے بلبلا اٹھے ہیں۔ چودھری صاحب پولیس میں اے ایس آئی تھے۔ ان کے خلاف کیس ہوا اور انہیں ریورٹ کر دیا گیا۔ گجرات کے رہنے والوں کو معلوم ہے کہ چودھری صاحب نے عبدالغنی گھمن کے ساتھ مل کر گھی میں ملاوٹ کے کون کون سے تجربے کئے تھے۔ پھر انہوں نے ایوب خان کے عہد میں چودھری صاحب کو بتِ آمریت کے سامنے سجدہ کرتے دیکھا۔ لائسنس کس طرح آتے رہے۔ اور کہاں فروخت ہوتے رہے۔ ووٹر اب احتساب کے موڈ میں ہیں۔ انہیں مٹھائیاں اور سکوں کی کھنک خرید نہیں سکتی۔

چودھری ظہور الٰہی کا اپنے علاقے سے کس قدر گہرا رابطہ ہے۔ اس کا اندازہ ایک دلچسپ واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے وسط میں جناب دولتانہ گجرات تشریف لائے۔ اس موقع پر چودھری صاحب نے بہت بڑے جشن کا اہتمام کیا اور اپنے علاقے کے با اثر افراد کو دعوت نامے بھیجے ایک دعوت نامہ ایک ایسے شخص کو بھی بھیجا تھا۔ جس کا انتقال ۱۹۶۶ء میں ہو چکا تھا۔ وہ دعوت نامہ مرحوم کے لڑکے کو ملا۔ جو غالباً کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ چودھری ظہور الٰہی کے پاس گیا اور بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"چودھری صاحب! آپ بہت بڑا سیاسی جلسہ بلا رہے ہیں۔ میرے والد تو یہاں نہیں آئے؟"

"وہ پرسوں تو یہاں تھے، کل نہیں دیکھا"

اس جواب پر طالب علم مسکرا دیا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

چودھری صاحب کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں، اس لئے وہ مختلف افراد کو نیشنل بنک سے قرضوں کی پیش کش کر رہے ہیں، معلوم ہوا ہے وہ نیشنل بنک کے ڈائریکٹروں میں سے ہیں۔ اس قسم کی لالچ سے گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا جا رہا ہے

(ہفت روزہ زندگی ۔ ۷ ۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء)

بدعنوانی کے الزام میں ہیڈ کانسٹیبل سے کانسٹیبل بنا دیئے گئے

وہ اپنے ساتھیوں میں "جھورا بٹے والا" کے نام سے مشہور تھے

سے دوبارہ فروخت کر دیا۔ اس دفعہ ان کو پہلے سے بھی زیادہ قیمت ملی۔ لاکھوں روپے کے وارے نیارے ہو گئے۔

مگر اس دفعہ بھی وہ مار کھا گئے۔ یہ زمین نیشنل بنک آف پاکستان کے پاس رہن تھی۔ یہ عقدہ اس وقت کھلا جب خریداروں نے زمین کی منتقلی کے لئے بیع نامے کرائے۔ چنانچہ خریداروں نے قانون کا سہارا لیا اور عدالت سے رجوع کیا۔ جعل سازی کے کئی مقدمات ظہور الٰہی کے خلاف دائر ہوئے۔ آخر کار سینکڑوں پلاٹوں کی یہ خریداری منسوخ قرار پائی۔ ظہور الٰہی جیل جاتے جاتے رہ گئے۔

جعل سازی کا یہ اسکنڈل اس قدر مشہور ہوا کہ ظہور الٰہی کچھ عرصے کے لئے گوشہ نشین ہو گئے۔ ملنے جلنے والوں سے کتراتے۔ مگر خاموش بیٹھنا اور تجربات سے سبق حاصل کرنا ان کی فطرت نہیں۔ دولت ان کی بنیادی کمزوری ہے۔ اس دفعہ انہوں نے کمائی کا ایک نیا دھندا شروع کیا۔ گجرات میں اپنے والد چوہدری سردار کے نام پر پانچ لاکھ روپے کے فنڈ سے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ اس ٹرسٹ کو رفاہ عامہ کا فلاحی ادارہ بتایا گیا۔ اس منصوبے میں ایک خیراتی اسپتال کا قیام بھی شامل تھا۔ چنانچہ حکومت کا دباؤ ڈلوا کر علیسائی مشینریز سے اس اسپتال کے نام پر ۱۲ ایکڑ زمین نہایت سستے داموں پر خرید لی گئی ساتھ ہی ان ہی سے ایک بہت بڑی عمارت بھی صرف دو لاکھ روپے میں خرید لی۔

کچھ عرصے تک خیراتی اسپتال کا نام چلتا رہا۔ پھر یہ تمام زمین ۸۴ رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کر دی گئی اور ہر پلاٹ چار ہزار روپے کے عوض فروخت کر دیا گیا۔ رہ گئی ٹرسٹ کے نام پر خریدی ہوئی عمارت، وہ منہ مانگے کرائے پر زرعی ترقیاتی کارپوریشن کو کرائے پر دیدی۔ اسپتال کے نام پر دواؤں کے جو لائسنس ملے، وہ بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوتے اسی طرح ٹرسٹ اور خیراتی اسپتال مستقل آمدنی کا ذریعہ بن گیا نام عوام کی فلاح و بہبود کا تھا۔ اور بنک بیلنس ظہور الٰہی کا بڑھا

ایوب خان کے عہد حکمرانی ہی میں چوہدری ظہور الٰہی نے آزاد کشمیر میں محکمہ جنگلات سے اپنے ایک رشتہ دار کے نام بہت بڑا ٹھیکہ لیا ہوا تھا [illegible] ٹھیکے کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جاتی رہی [illegible] لاکھوں روپے کی [illegible]

لاہور لائی گئی اور کھلے عام فروخت ہوئی۔ جاننے والے جانتے تھے، مگر خاموش تھے۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ ایوب خان کی ناراضگی کا خوف دامن گیر تھا جن کے زیر سایہ چوہدری ظہور الٰہی کو ہر دھاندلی اور ہر بدعنوانی کی اجازت تھی۔ ویسے بھی پولیس کے ساتھ ان کا دیرینہ یارانہ تھا اور حکام سے گہرے مراسم تھے۔

اسی لاہور میں ظہور الٰہی نے کئی کارخانے اور فیکٹریاں قائم کیں۔ اپنی جیب سے ان پر کچھ نہ لگایا۔ سب بنکوں کے قرضے سے بنیں۔ اسی دوران انہوں نے ایوب خان کی خصوصی خدمات کے صلے میں شراب تیار کرنے والی کمپنی بنیز کے لئے پرمٹ حاصل کیا۔ اس کا معاوضہ یہ ملا کہ بنیز والوں نے دو لاکھ کے حصص بغیر کسی رقم کے ظہور الٰہی کے نام منتقل کر دیئے۔ اس طرح یہ اس کے ڈائریکٹر بنے اور آٹھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ وصول کرتے رہے۔

۱۹۶۹ء کے آغاز میں جب مغربی پاکستان میں عوامی تحریک پیپلز پارٹی کی قیادت میں اپنے شباب پر تھی۔ ایوب آمریت کے قلعہ میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے۔ مظاہرے، ہڑتالیں، جلسے، جلوس روزمرہ کا معمول تھا۔ کہیں گولی چلتی تھی، کہیں لاٹھی۔ شاہراہیں خون کے چھینٹوں سے سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ عوامی رہنما، طلبہ اور مزدور گرفتار ہوتے اور جیلوں میں بند کئے جاتے۔ جماعت اسلامی، مسلم لیگیں اور نیپ ایوب حکومت کو آخری سہارا دینے کے لئے گول میز کانفرنس کے گرد چکر کاٹتیں۔ ملک کے طول و عرض میں قیامت برپا تھی۔ عوام سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ایوب خان کا راج سنگھاسن ڈول رہا تھا۔ سیاسی بحران اپنے عروج پر تھا۔ اس وقت بھی چوہدری ظہور الٰہی اپنے دھندے سے لگے ہوتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے مغربی پاکستان کے سابق گورنر موسیٰ خان کے بھائی خدا اسحاق اور سابق ڈپٹی سکریٹری ظہیر سجاد کو دو لاکھ روپے رشوت دے کر گورنمنٹ سنٹر شاہدرہ کی ۵۲۵ کنال زمین صرف ۴۲ لاکھ روپے میں حاصل کر لی۔ یہ راز اس وقت کھلا جب نیشنل فین تیار کرنے والی کمپنی کے مالکان محمد دین اینڈ سنز نے ہائی کورٹ میں اس سودے کے خلاف رٹ درخواست دائر کر دی اور اس زمین کے لئے ایک کروڑ روپے کی پیشکش کی۔

ابھی یہ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا کہ یحییٰ حکومت کا زوال ہوا اور اقتدار مملکت پیپلز پارٹی کے ہاتھ آیا۔ ظہور الٰہی کونسل لیگ کے رہنما تھے، جو حزب اختلاف کی ایک جماعت تھی، مگر جماعتی وفاداریوں کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو یہ پیشکش کی کہ اگر حکومت اس زمین کا فیصلہ عدالت سے ان کے حق میں کرا دے تو وہ خواتین کے انتخابات میں اپنے ووٹ پیپلز پارٹی کو دیں گے۔ مگر ان کی یہ پیشکش مسترد کر دی گئی اور ان کی امداد کے بغیر بھی خواتین کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی امیدوار کامیاب ہو گئیں۔

چوہدری ظہور الٰہی کے بارے میں یہ نئی بات نہیں۔ وہ قومی اسمبلی میں حکومت کے خلاف تقریریں کرتے تھے، اور درپردہ اس سے مراعات حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ جب ناکام ہوتے تھے، تو کہرام برپا کرتے تھے جتنی بڑی ناکامی ہوتی تھی، اتنا ہی زیادہ ان کی تقریروں اور بیانات میں طنطنہ ہوتا تھا۔ غصہ اور جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ نام عوام کا، جمہوریت کا، ملک اور قوم کا ہوتا تھا اور سیاست اپنی ذات کی ہوتی تھی۔

لوگو! یہ کیسی قوم ہے، یہ کیسے عوام ہیں، یہ کیسی جمہوریت ہے، یہ کیسا قانون ہے؟ جو شخص قوم کی جڑیں کھوکھلی کرے وہ قوم کا رہبر کہلاتے۔ جو عوام کا استحصال کرے وہ خود کو عوام کا ہمدرد، غمگسار کہے۔ جو جمہوریت کو قتل کرے وہی جمہوریت کا علمبردار بنے۔ جو قانون شکنی کرے، وہی قانون سازی بھی کرے۔ یہ کیا تماشہ ہے؟ یہ کیا روپ بہروپ کا ناٹک ہے۔

چند ہفتے پیشتر جمعیت العلمائے پاکستان کے ترجمان ہفت روزہ اُفق نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا تھا کہ ظہور الٰہی مشروبات کی ایک ایسی کمپنی کے پارٹنر بھی ہیں جس کو قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کراچی ریلوے اسٹیشن کے لئے لاکھوں روپے کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔

لیکن یہ "سیاسی بہروپ" چوہدری ظہور الٰہی کی سماجی اور سیاسی زندگی کا ایک روپ ہے۔ ان کی پہلودار شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں، بہت سے رُخ ہیں یہ چور دروازوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اب ہر دروازہ کھلتا جائے گا ہر پردہ اترتا جائے گا۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی سامنے آجائے گا۔ چوہدری ظہور الٰہی اسلام اور عوام کی خدمت اور جمہوریت کے تحفظ کے دعویدار ہیں جن کو کا یہ آئینہ بھی اسلام، عوام اور جمہوریت کی خاطر پیش کیا جا رہا ہے۔

❀❀

جس نے آپ کی
امان چاہی
اسے کو بخش دیا
****

راؤ فرمان علی نے بھی ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں دھاندلی کی تھی

حسین نقی

میرے انتہائی محترم بزرگ، اور ایک طویل عرصہ تک انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے علمبردار، ۶۹ - ۱۹۶۸ء میں بھٹو کے وکیل، ۱۹۷۲ء میں بھٹو مارشل لاء کے دفاع میں پیش پیش انہی دنوں کے وزیر قانون اور آج کل تحریک استقلال کے قائد جناب محمود علی قصوری (جن کے دورِ وزارت قانون میں اس ناچیز کو بھی آزادیٔ اظہار کا مزا چکھنا پڑا) نے اپنے تازہ ترین بیان میں اپنی جماعت کے مرکزی سینیئر نائب صدر جناب وزیر علی کے بیان کی زیادہ واضح تائید فرمائی ہے۔

میاں صاحب نے جو بلاشبہ پاکستان کے انتہائی محترم قانون دانوں میں شمار ہوتے ہیں، پریس ٹرسٹ کے مقامی انگریزی روزنامے کے مطابق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں بدعنوانیوں کے مرتکب تمام افراد کو پھانسی کی سزا دی جائے کہ انہوں نے انتخابات میں دھاندلی کر کے دستور کو تباہ کر دیا ہے۔ اور دستور کی تباہی (انہوں نے SUBVERSION کا لفظ استعمال کیا ہے) بغاوت کے مترادف ہے جس کی سزا دستور کے مطابق موت ہے۔

میاں صاحب کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ انہوں نے بھٹو کے علاوہ ان لوگوں کے لئے بھی پھانسی کی سزا طلب کی ہے جنہوں نے کھلم کھلا بھٹو صاحب کی اعانت کی۔

ایک ماہر قانون داں اور ایک پرانے سیاستداں جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھی حصہ لیا ہوا ہے، میاں صاحب کو قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۶ء سے قیام پاکستان کے بعد اب تک کے تمام الیکشنوں کے متعلق ذاتی معلومات ہوں گی۔ ان میں سے کئی انتخابات میں میاں صاحب نے خود بھی حصہ لیا ہوا ہے اور مجھ سے بہتر انہیں ان تمام انتخابات میں ہونے

والی دھاندلیوں کا علم ہے۔ میاں صاحب نے مادرِ ملت کی انتخابی مہم میں بھی بہت نمایاں حصہ لیا تھا اور ان کے علم اور تجربہ میں اس انتخاب کی دھاندلیاں بھی موجود ہیں اور کئی عذر داریوں میں وہ خود بھی بطور وکیل پیش ہوئے تھے۔

پھر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں اس ملک کی تاریخ کی سب سے بڑی اور مکمل دھاندلی والا الیکشن ہوا اور خود میاں صاحب وہاں ریوڑیوں کی تقسیم میں پیپلز پارٹی کا حصہ ریٹائرڈ میجر جنرل راؤ فرمان علی خاں صاحب سے لینے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے تو میاں صاحب کو بھی ضرور یاد ہو گا۔ اس صریح کھلم کھلا مکمل دھاندلی والے انتخابات میں مزید جو دھاندلی ہوئی تھی اس کا ذکر میاں محمود علی قصوری نے اسی زمانے میں اپنے ایک بیان میں کیا تھا جو مغربی پاکستان میں ہماری نظروں سے گذر چکا ہے۔

میاں صاحب مجھ سے بہتر جانتے ہیں بلکہ انہیں تو دساتیر ازبر ہیں۔ فیصلے بھی ازبر ہیں۔ نظیر میں بھی کہ پاکستان اور غالباً دنیا بھر کے دساتیر میں بغاوت (TREASON) کی سزا موت ہے اور یہ اضافہ مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد نہیں کیا گیا۔

پھر میاں صاحب، اگر دھاندلی کا منصوبہ بنانے والوں اور اس منصوبے پر عملدرآمد کرانے والوں کی سزا ایک ہی ہے "پھانسی" تو پھر کم از کم ۱۹۴۷ء سے اب تک تمام یعنی جو بھی اکا دکا انتخابات اس ملک میں ہوتے رہیں ان میں دھاندلی کروانے کا منصوبہ بنانے والوں، اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے والوں، اس میں ملوث ہونے والوں سب کی ایک ہی سزا ہے: موت، پھانسی کے ذریعہ! میاں صاحب قانون داں ہیں۔ قانون کی نظر میں کہا جاتا ہے "سب برابر ہوتے ہیں"۔ اپنی سیاسی زندگی کے بیشتر سالوں میں میاں صاحب قانون کی بالادستی، قانون کی نظر میں سب کی برابری کے لئے واقعتاً عملی جدوجہد کرتے رہے ہیں تو پھر میاں صاحب! آپ سقراط بننا پسند کریں گے؟

میں تو انتہائی ان پڑھ آدمی ہوں، سنا ہے کہ سقراط کے شاگردوں نے اسے کہا تھا کہ وہ چور دروازہ بنائے دیتے ہیں، اسے نکال بھی لے جا سکتے ہیں۔ اسی چور دروازے سے، لیکن استاد نے کہا نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ریاست کا قانون سب سے افضل ہے اور میں قانون کے مطابق عمل کروں گا اور پھر جب وقت آیا تو زہر کا پیالا پی لیا۔

چلیں یہ تو کہانی ہوئی۔ میاں صاحب سے ایک بات اور پوچھتا چلوں کہ میاں صاحب ہمارے ملک کے انتہائی قابلِ احترام اہم ترین ماہرین آئین میں سے ایک ہیں۔ میاں صاحب بتلائیں کہ دستور کو تہس نہس کرنا، دستور کی خلاف ورزی کرنا دستور میں دی گئی قسموں کی خلاف ورزی کرنا قابلِ پھانسی جرم ہے تو اس کی سزا ہمارے ملک میں آج تک کس کس کو اور کب کب دی گئی ہے یا دینی چاہیئے یا ہمارے ملک میں سیاستدانوں کے پاس پھانسی کا بس ایک ہی پھندہ ہے اور محض ایک ہی گلے میں وہ پھندہ فٹ آ سکتا ہے ورنہ انصاف کا تقاضا تو یہی ہونا چاہیئے کہ جس جس نے دستور کو توڑا ہو ان سب کے لئے ایک ہی سزا ہو۔

لیکن زیادہ سنجیدہ بات یہ ہو گی کہ ہم یہ سنگساری کا کاروبار ابھی شروع نہ کریں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سیاسی حمام میں (اور اس سیاسی حمام میں غیر سیاسی سیاست کار اور سیاستداں دونوں ہی موجود ہیں، اگر ہم

پاکستان کی تقریباً اکتیس سالہ تاریخ سے واقف ہوتے ہوئے ڈنڈی نہ ماریں) سب ہی مادر زاد برہنہ ہیں۔ محاورۃً میں۔ اس لئے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم پاکستان کو افراتفری کے دور میں دھکیلنے کے بجائے اس کے مختلف اداروں کو (اگر ہمارا مقصد پاکستان کی مزید توڑ پھوڑ نہیں) بہتر بنیادوں پر استوار کریں اور یہ کارِ خیر جب ہی ہو سکتا ہے جب ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی کے با اثر اور با اختیار تمام ادارے اور افراد اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی جرأت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہمارا قومی اخلاق و کردار ہمارے سامنے ہے۔ اس میں سیاست داں، وکیل، صحافی، جرنیل، سرکاری افسر شاہی واہل کار، تاجر، زمیندار، کارخانہ دار، اساتذہ غرضیکہ ہر کوئی حصہ شامل ہے۔ کسی ایک حلقے سے، کسی ایک گروہ سے بہتر یا مثالی کردار کا مطالبہ کرنا غلط ہے اور اس سے بھی زیادہ غلط کسی ایک حلقے سے گروہ یا فرد کو اپنی معاشرتی غلاظتوں کے لئے مواد الزام ٹھہرا کر قربانی کا بکرا بنانا اور اس پر مطمئن ہونا۔

انتخابات میں دھاندلی ہوئی۔ کوئی ڈھیٹ ہٹ دھرم ہی اس سے انکار کرے گا۔ لیکن یہ کہنا بھی اسی قدر ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی ہے کہ یہ محض یک طرفہ تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور قابلِ شرم بات یہ ہے کہ جس نے آپ کی امان چاہی اور اپنے آپ کو قدموں میں ڈال دیا اس کو بخش دیا گیا۔ طرفداروں کے گھناؤنے جرائم پر پردہ ڈال دیا گیا۔ اس عمل سے ملک گیر پیمانے پر موجودہ کشیدگی کو تو بڑھاوا دیا جا سکتا ہے۔ اصول پرستی اور انصاف پسندی کا بول بالا نہیں ہو سکتا۔

انتخاب میں دھاندلی ہوئی۔ ان کے نتائج رد کر دیئے گئے۔ لہٰذا اب صاف ستھرے انتخابات کرائیے نہ کہ اعلان کر کے اور ڈنکے کی چوٹ پر اس دھاندلی کی تیاری شروع کی جائے کہ نتائج مثبت نکلیں۔ نتائج تو بھٹو صاحب کے بھی "مثبت" نکلے تھے۔ حالانکہ ہر واقفِ حقائق یہ جانتا ہے کہ دھاندلی کے بغیر بھی بھٹو پارٹی جیت رہی تھی۔ جیت گئی تھی۔ اور آج بھی اگر اس کے جیتنے کی دہشت اور خوف نہ ہو تو انتخابات کرا دیئے جائیں۔

جہاں تک نظریاتی بائیں بازو کا تعلق ہے مندرجہ بالا گذارشات کے ساتھ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ سرکار کا جاری کردہ "وائٹ پیپر" ہمارے ملک کے کرم خوردہ افسر شاہی، سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ، معاشرتی ڈھانچہ اور اس کے حکمراں گروہوں کا خود تسلیم شدہ اعتراف ہے۔ جو یہ ثابت کرتا ہے۔ افسر شاہی، سرمایہ دار۔ جاگیردار گٹھ جوڑ پچھلے تیس سال حکمرانی کرنے کے باوجود ملک اور قوم کو سوائے تباہی اور بربادی، اخلاق باختگی، دھاندلی، اور بددیانتی کے کچھ اور دے سکنے کے قابل نہیں بن سکا۔ لہٰذا اس حکمراں اور اقتدار پر قابض ٹولہ کو دستبردار ہو جانا چاہیئے ورنہ تاریخی تقاضے پورے کرنے والی قوتوں کو یہ کام انجام دینا ہو گا۔ آپ کی مرضی ہے کہ آپ جنہوں نے اس ملک پر حکمرانی کی۔ جنہوں نے اس سے سب سے زیادہ پایا، آرام سے اپنی نااہلی اور ناکامی کا اعتراف کریں گے اور راستہ سے ہٹ جائیں گے یا آپ کا ارادہ کچھ اور ہے۔ بہتر ہے کہ آپس میں دست و گریباں نہ ہوئیے۔ اور اپنی بدکرداریوں کے عوض اپنی لوٹ مار سے عوام کا حق، زکوٰۃ ادا کر دیجئے!!! واقعاً آپ کے لئے یہی بہتر ہے!!! میری مانیئے!!! اپنے آپ کو مشکل میں نہ ڈالئے!!!۔

ــ اسی مبصر

ازراہ کرم نام بدل ڈالیئے۔ اسے اینٹی الیکشن سیل کہیئے۔ اسے نان الیکشن سیل کہیئے۔ مارشل لاء کی گھنٹی کہیئے۔ عوام کا جہنم کہیئے۔ گلاب کے پھولوں کا باغ کہیئے لیکن اس کا نام تبدیل کر دیجیئے۔ کیوں؟

(الف) ۳۶۵ دنوں سے زیادہ عرصے میں اس سیل نے انتخابات کی سمت میں ایک گھونگھے کی طرح بھی قدم نہیں بڑھایا۔

(ب) ۳۶۵ دِنوں سے زائد مدّت میں اس نے مخالف سمتوں میں لمبی لمبی چھلانگیں لگائی ہیں۔ اس طرح انتخابات پر تنقید کی ہے کہ ایک ایسے ملک میں انتخابات کس طرح ہو سکتے ہیں جس میں ۱۵ سے زیادہ جماعتیں ہیں؟

(ج) اس (الیکشن سیل) کا ایک رکن لندن سے جام صادق کو لائے گیا تاکہ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین کے خلاف قتل کے مقدمے میں وعدہ معاف گواہ بنایا جائے۔ سپریم کورٹ میں جام صادق نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا ہے "جنرل فرمان علی نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں مسٹر بھٹو کو نام نہاد سانگھڑ کے حروں کے مقدمۂ قتل کے من گھڑت الزامات میں پھنسوا کر ان سے نجات حاصل کرنے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی مدد کروں"۔

(د) الیکشن سیل کے ایک اور رکن نے پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین پر، خصوصاً غیر ملکی صحافیوں کے سامنے، شدید نکتہ چینی کی۔

(س) اہم افراد اور سیاستدانوں کے ساتھ سیل کے خاص خاص مذاکرات ہر خاص و عام کو معلوم ہیں۔ سیل انتخابات اور جمہوریت کی تنظیم نہیں کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہٹلر کو یہودیوں کی دوبارہ آبادکاری کا انچارج بنا دیا جائے۔

اب مارشل لاء کی بالادستی کے لئے ایک نام نہاد سول کابینہ بنائی گئی ہے جس میں "سی" (برائے سول) چھوٹا اور "ایم" (برائے مارشل لاء) بڑا ہے۔ اب مارشل لاء کی چھتری تلے وزارتی اختیارات رکھنے والے وزراء ہیں۔ چھوٹے بابو یعنی مشیر جا چکے ہیں۔ یہ بڑے بابو الیکشن سیل کے ضرورت مند نہیں ہیں۔ اگر انتخابات کبھی ہوئے بھی تو انہیں "دھاندلی" کے لئے الیکشن سیل کے ان موجودہ لوگوں کی بہ نسبت بہتر کام کرنا چاہیئے۔ جنہیں "دھاندلی" کا تجربہ نہیں ہے۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ۲۵ رجون ۱۹۷۸ء کی تقریر کے مطابق چیف الیکشن کمشنر کو پاکستان میں پاکستان دشمن اور اسلامی پاکستان میں اسلام دشمن جماعتوں کو ذبح کر دینا ہے۔ ہمارے لندن کے ٹاور میں ہونے والی اس مشق کی روشنی میں اس پریشان کن الیکشن سیل کی ضرورت کیا ہے؟ علاوہ ازیں یہ زیادہ کھیل چکا اور ٹھہر چکا ہے۔ لندن کے ٹاور کی یہ مشق اور کلہاڑی والا آدمی عوام کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ اس دور کی تجدید کرنا ناممکن ہے۔

اس قسم کی سازشی حیلہ سازیاں ناکام ہو جائیں گی جب انتخابات کی دھوم مچے گی تو سارے بند ٹوٹ جائیں گے اور پانی اپنی سطح کا خود تعین کرے گا۔ کیا یحییٰ خان کا لیگل فریم ورک آرڈر اب بھی برقرار ہے جس کے ڈھول پیٹے جاتے تھے؟ نہیں۔ یہ عوام کے بوجھ سے ڈھے گیا۔ پاکستان کو پیش آنے والی متبادل صورت، بلکہ جو اُن کے سر پر منڈلا رہی ہے، شک و شبہ سے بالاتر صاف ہو گئی ہے یا ذبح ہوئے بغیر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ۔ یا پھر ان سے قطعی لاتعلقی یہ کوئی دھمکی نہیں ہے ۔ یہ نوشتہ دیوار ہے۔ صرف عوام ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انتخابات میں کتنی جماعتیں حصہ لیں۔ "جیک دی ریپر" جیسی سوچ کام نہیں دے گی۔

موجودہ حکومت کا

واحد مسئلہ بھٹو ہے

راشد بشیر

"قرطاس ابیض" جسے بعض لوگوں نے "قرطاس اسود" قرار دیا ہے کچھ زیادہ دھماکہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں ریڈیو اور ٹیلیویژن پر جو پروگرام پیش کئے جا رہے ہیں انہیں سامعین اور ناظرین کی کتنے فی صد تعداد سن اور دیکھ رہی ہے اور اثر لے رہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک موقعے پر حکومت کے ایک ذمہ دار فرد نے برسر عام اشاعت و تشہیر کے ذمہ دار افسروں پر شدید برہمی کا اظہار کیا۔ فی الحال ہم نہ تو اس قرطاس کے مواد کو زیر بحث لانا چاہتے نہ ہی ان لوگوں کا دفاع ہمارا مقصد ہے جنہیں بولنے اور اپنا موقف پیش کرنے کا موقعہ دیئے بغیر مواد الزام ہی نہیں بلکہ مجرم قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ (اس قرطاس ابیض کی اشاعت پر زبردست خرچ قومی خزانے اور عوام کے ٹیکسوں سے کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ لندن سے ملنے والی ان اطلاعات سے ہوتا ہے کہ انگلستان میں اس کی مفت تقسیم کے لئے اشاعت پر ۲۱ ہزار اسٹرلنگ پاؤنڈ یعنی تقریباً سوا چار لاکھ روپے خرچ کئے گئے ہیں) ہم صرف اس بات کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں دھاندلی اور بدعنوانی کا اس قدر زرِ کثیر صرف کر کے ثابت کرنا ضروری تھا بھی یا نہیں۔

اس نکتۂ نظر سے اگر پچھلے سال کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو جو حقائق سامنے آتے ہیں مختصراً یہ ہیں۔

ا۔ ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو پولنگ شروع ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی کم از کم تمام بڑے شہروں کے لوگ

قرطاسِ ابیض کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے

انتخابات میں دھاندلی بڑا جرم ہے یا ملک کو توڑنے کی سازش کرنا

اس بات کے عینی شاہد بن گئے تھے کہ پولنگ میں بے قاعدگی اور پولنگ اسٹیشنوں پر غنڈہ گردی ہو رہی تھی اور جب ریڈیو اور ٹیلی وژن نے نتائج کا اعلان شروع ہوا تو یہ یقین ہو گیا کہ انتخابات منصفانہ نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ ۱۰ر مارچ کو صوبائی اسمبلیوں کے وسیع اور موثر بائیکاٹ نے اس یقین کو عملی اظہار کی شکل دیدی تھی

۳۔ ۱۴ر مارچ کو کراچی اور اوائل اپریل میں پنجاب اسمبلیوں کے اجلاسوں کے خلاف احتجاج نے اس اظہار کو شدت دی۔ اس کے بعد احتجاجی تحریک اس حد تک آگے بڑھی کہ ملک میں جزوی (بقول جنرل ضیاء لنگڑا لولا) مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔

۴۔ اس احتجاجی تحریک کے دوران بھٹو حکومت نے چیف الیکشن کمشنر کو اختیار دیا کہ وہ اپنے صوابدید کے مطابق تحقیقات کر کے کسی انتخاب کو کالعدم قرار دے۔ گو یہ اختیار بعد میں واپس لے لیا گیا لیکن جتنے دن یہ اختیار حاصل رہا اس دوران کمیشن نے کئی انتخابی عذر داریوں کی سماعت کی جن کے دوران یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انتخابات میں بدعنوانیاں ہوئیں اور اسی بناء پر کئی نتائج کالعدم قرار دیدیئے گئے۔

۵۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے ابتداء میں ہی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دوبارہ کرواتے پر رضامندی ظاہر کر دی جو بالواسطہ طور پر انتخابی بدعنوانیوں کا اعتراف تھا۔ جون ۱۹۷۷ء میں تو قومی اسمبلی کے بھی دوبارہ انتخابات کروانے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔

یہ حقائق یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ ساری قوم اس بات کی قائل ہو گئی تھی کہ انتخابات میں بدعنوانیاں ہوتی رہیں۔

انتخابات کے کردار کے بارے میں تنازعہ صرف پاکستان میں محدود نہیں رہا تھا بلکہ تمام بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے اس صورتِ حال کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی اس طرح بین الاقوامی رائے عامہ بھی اس بات کی قائل ہو گئی کہ انتخابات میں کسی نہ کسی حد تک کھلی دھاندلیاں، بے ضابطگی اور لاقانونیت ہوئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک ایسی بات جس پر قومی اور بین الاقوامی رائے عامہ پہلے ہی سے قائل ہے اس پر اتنے وسائل اور سرکاری ملازمین کی محنت صرف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کے جواب میں اگر بعض لوگ یہ رائے قائم کریں کہ موجودہ حکمرانوں کی نظر میں نواب محمد احمد خان کے قتل کے مقدمے میں مسٹر بھٹو کی منفی تشہیر (جسے ان کے حامی کردار کشی بھی کہتے ہیں) رائے عامہ کو ضروری حد تک ان کے خلاف کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس لئے قرطاس ابیض شائع کرنے کا اصل مقصد انتخابی بدعنوانیوں کو اجاگر کرنا نہیں بلکہ رائے عامہ کو مسٹر بھٹو کے خلاف ہموار کرنا ہے۔ اگر یہ رائے درست تسلیم کی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ مقصد بذاتِ خود مقصد نہیں ہے بلکہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اس کو بیان کرنا چنداں ضروری نہیں۔ کیوں کہ یہ سوال قومی اور بین الاقوامی سطح پر ۱۸ر مارچ ۱۹۷۸ء سے مسلسل زیر بحث ہے۔

اس قرطاس ابیض کی اشاعت سے ایک اور سوال ابھر کر سامنے آیا ہے کہ انتخابات میں دھاندلی کرنا بڑا جرم ہے یا ملک کو توڑنے کی سازش کرنا اور اس مقصد کیلئے کام کرنا بڑا جرم ہے؟ ملک سے محبت کرنے والا ایک عام آدمی کسی جھجک کے بغیر یہ جواب دے گا کہ ملک کو توڑنے کی سازش اور اس میں عملاً ملوث ہونا نہ صرف بڑا بلکہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں ملک کے ایک حصے کے ایک علیحدہ آزاد مملکت بن جانے کے بعد سے عوام کا یہ مطالبہ رہا ہے اور حزب اختلاف کی تمام جماعتیں اسکی ہمنوائی کرتی رہی ہیں کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے والوں کو سامنے لایا جائے اور انہیں ان کے جرائم کے مطابق سزا دی جائے۔ یہ مطالبات اتنی شدت اختیار کر گئے تھے کہ عوام کو دلاسہ دینے کے لئے سابق چیف جسٹس پاکستان حمود الرحمٰن کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا اس کمیشن نے فوجی اور غیر فوجی سرکاری ملازمین اور غیر سرکاری افراد کے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اپنی رپورٹ بھٹو حکومت کو پیش کر دی۔ اس کے بعد سے مختلف عوامی حلقے اور خاص طور پر حزبِ اختلاف کی جماعتیں بھٹو حکومت پر اس بناء پر تنقید کرتی رہیں کہ مذکورہ کمیشن کی رپورٹ شائع نہیں کر رہی ہے اور کبھی مضمر طور پر اور کبھی برملا یہ کہا جاتا رہا کہ یہ رپورٹ اس لئے شائع نہیں کی جا رہی ہے کہ اس میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو بھی ملوث کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات بہت واضح ہے کہ ملک کے ٹوٹنے میں حالیہ پاکستان اور سابق مشرقی پاکستان کے عام آدمی کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ذمہ دار با اختیار

وبا اقتدار لوگ ہیں۔ چاہے وہ کوئی ہوں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ بھٹو برسراقتدار نہیں۔ ان کے کئی ساتھیوں کو انتخابات کے لئے نااہل قرار دیا جاچکا ہے اور کئی ایک کو دیا جانیوالا ہے۔ موجودہ حکمران احتساب کو اجتماعی قومی سیاسی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور ملک کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا اور وسیع تر قومی مفاد کا تقاضہ تو یہ تھا کہ موجودہ حکمرانوں کے برسراقتدار آنے کے فوری بعد بلا تاخیر یہ رپورٹ شائع کردی جاتی تاکہ وہ بے گناہ لوگ جنہیں اس المیے کا ذمہ دار قرار دیا جارہا ہے انکا اعتبار بحال ہوتا اور دوسری طرف غدار لوگ بے نقاب ہوکر اپنے انجام کو پہنچتے۔ اس رپورٹ کو روک کر انتخاب کے بارے قرطاس ابیض شائع کرنا اس شبہے کو تقویت دیتا ہے کہ موجودہ حکومت ایک شخص (بھٹو) سے جان چھڑانے کو وسیع تر قومی مفادات پر بھی ترجیح دے رہی ہے اور فی الحال اس کی تمام تر توجہ اسی ایک نکتے پر مرکوز ہے ملکی اور قومی مفاد کو دوسری تمام باتوں پر ترجیح دینے والے عام پاکستانی صرف حیران ہی ہو سکتے ہیں کہ آخر وہ کون زور آور لوگ ہیں جن کے سامنے مسٹر بھٹو اور موجودہ حکومت دونوں ہی بے بس تھے اور ہیں یا پھر انہیں ہر قیمت پر بچانے پر مجبور ہیں۔

اسی ضمن میں ایک بات جو خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ حزب اختلاف کی جماعتوں کے رہنماؤں نے کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے سلسلے میں بھٹو حکومت کے زمانے میں تو پرزور مطالبہ کیا اور اس کی قومی اہمیت پر زور دیتے رہے لیکن اب نہ جانے کون سی مصلحتیں ہیں کہ اس کا ذکر بھی نہیں کیا جارہا ہے۔

ہم اتنی بات جانتے ہیں کہ آج حالات کچھ بھی ہوں لیکن جو لوگ بھی اس المیئے کے ذمہ دار ہیں اور جو لوگ بھی انہیں تحفظ فراہم کر رہے ہیں انہیں نہ تو تاریخ معاف کرے گی نہ آنے والی نسلیں۔

ایک اور بات یہ ہے کہ قرطاس ابیض کے سلسلے میں جو پروپیگنڈہ مہم جاری ہے اس میں ہر خرابی اور برائی کا ذمہ دار مسٹر بھٹو کو قرار دیا جارہا ہے اور ان کے بعد اگر کسی فرد کے معاملے کو اہمیت دی جارہی ہے تو وہ ان کے بڑے وکیل یحییٰ بختیار کا معاملہ ہے۔ جب کہ ملک اختر، حفیظ اللہ چیمہ اور میاں عطاء اللہ کے ثابت شدہ معاملات کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی قرطاس ابیض کے اصل مقاصد کی طرف نشاندہی کرتی ہے

قرطاس میں جو دستاویزات اور واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ کھلی گواہی دیتے ہیں کہ سرکاری مشینری کے کل پرزے اعلیٰ افسران سے لے کر نچلی سطح کے ملازمین ان بے ضابطگیوں، بے قاعدگیوں، دھاندلیوں اور لاقانونیت میں ملوث رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار یا حصہ دار سرکاری ملازمین کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے گی یا انہیں اس بنا پر بے قصور قرار دے دیا جائے گا کہ انہوں نے سربراہِ حکومت یا اعلیٰ افسران کے حکم کی تعمیل میں ان غیر قانونی حرکات کا ارتکاب کیا تھا۔ اگر دوسری صورت ہوئی تو اس سے جو خطرناک روایت قائم ہوگی۔ اس کے بعد اس ملک میں آئین یا قانون کی کیا وقعت باقی رہ جائے گی۔

ان معروضات کی روشنی میں اصل بات قرطاس ابیض یا اس کی تشہیری مہم نہیں ہے بلکہ اس کے اصل مقاصد اور اس کے حصول کے لئے ہونے والے اقدامات ہیں

◎◎

چور مچائے شور

یوں تو لوگ جماعت اسلامی کے ترجمان "جسارت" اور اس کے ایڈیٹر مولوی محمد صلاح الدین کے بارے میں کیا کچھ کہتے رہتے ہیں مگر اب کی بار مولوی صاحب نے خود یہ ثبوت فراہم کیا ہے کہ سی۔ آئی۔ اے کے لئے کام کرنے، روسی یہودیوں کو اسرائیل جانے کی ترغیب دینے اور عالمی صیہونی تنظیموں سے رابطہ رکھنے کے جرم میں سزا پانے والے روسی یہودی اناطولی شرانسکی کے ساتھ اُن کی نالی جُڑی ہوئی ہے اور وہ دونوں ایک ہی جگہ سے ذہنی اور جسمانی غذا حاصل کرنے والے پیر بھائی ہیں۔ یقین نہ آئے تو یکم اگست ۱۹۷۸ء کا جسارت دیکھیے۔

یکم اگست کے جسارت میں مولوی محمد صلاح الدین نے اخبار کا پورا نصف صفحہ یہودی شرانسکی کی حمایت میں مضمون اور شرانسکی کے حامیوں کی تصویروں کے لئے وقف کر دیا ہے۔ مولوی محمد صلاح الدین رقم طراز ہے کہ روسیوں نے یہودی شرانسکی کو سی۔ آئی۔ اے کے لئے جاسوسی کرنے، بین الاقوامی صیہونی تنظیموں سے رابطہ رکھنے اور روسی یہودیوں کو اسرائیل جانے کی ترغیب دینے کے جرائم کی سزا دے کر انسانی حقوق کو پامال کیا ہے۔ یعنی جماعت اسلامی کا یہ "دانشور" دوسرے ملکوں کے لئے اپنے ملک کے خلاف جاسوسی کرنے کو بھی بنیادی انسانی حقوق کا حصہ سمجھتا ہے ہو سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کی مذہبی اخلاقیات کے عین مطابق اپنے وطن کے خلاف جاسوسی کرنا کارِ ثواب ہو۔ اور پھر مولوی محمد صلاح الدین سی۔ آئی۔ اے کے لئے کام کرنے میں اس لئے بھی ہرج محسوس نہیں کرتے ہوں گے کہ وہ خود بھی تو اپنی صحافتی برادری کے خلاف سی۔ آئی۔ ڈی کے لئے کام کرتے ہیں۔ البتہ روسی یہودیوں کو اسرائیل جانے کی اجازت سے روسیوں کے انکار اور صیہونی تنظیموں سے تعلقات روسی یہودیوں کو روکنے اور سزا دینے پر جماعتی دانشور کی جھنجھلاہٹ سے اس کی اسلام دوستی اور عربوں اور فلسطینیوں کی جدوجہد کی حمایت کرنے کے دعووں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ساتھ ہی ذمہ دارانہ صحافت کے اس نام نہاد علمبردار کا اصلی چہرہ بھی سب کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جسارت، نوائے وقت اور اس قبیل کے دوسرے پرچے صبح شام روس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں کے یہودی بھیج کر اسرائیل کو مضبوط کر رہا ہے۔ مگر جب روسی حکومت نے شرانسکی کو اسرائیل جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا اور یہودیوں کو اسرائیل جانے کے لئے اکسانے پر اُسے سزا دی تو یہ اصول پرست، ذمہ دار اور ایماندار "اسلامی" صحافی چلا اٹھے ہیں کہ روس نے یہودی شرانسکی کو سزا دے کر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی ہے۔

یہودی شرانسکی کو جاسوسی اور اسرائیل کی حمایت پر ملنے والی سزا پر احتجاج میں جماعت اسلامی کا یہ ترجمان تنہا نہیں ہے۔ بلکہ وہ امریکہ کے صدر جمی کارٹر، اسرائیل کے وزیر اعظم بیگن اور صیہونی نوجوانوں کی عالمی تنظیم

(باقی صفحہ ۵ پر)

اندرونِ سندھ

احسان عظیم

عوام کی زبوں حالی

جنرل اور رہنماؤں کے دورے، طلبہ کا مرن برت

لاء ھی لاء ہے، آرڈر کا دور دور تک پتہ نہیں

آخر کب تک نوکر شاھی چلے گی، لوگوں اپنی مدد آپ کرو

اندرونِ سندھ بادل برسے ہفتوں گذر چکے ہیں لیکن برسات کی تباہ کاریوں کا بھیانک منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ابتدا میں صوبائی حکومت کے ارباب بست وکشاد نے سب خیر کی صدا لگا دی تھی لیکن بُرا ہو برسات کے پانی کا کہ ڈھ ہر چہار سُو سے سمٹ کر لطیف آباد، پریٹ آباد، امریکن کوارٹر اور حیدر آباد شہر کے دوسرے نشیبی علاقوں میں جمع ہو گیا۔ پانی کیا جمع ہوا، طوفانِ نوح کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ بھرے پُرے آباد راستوں اور گلیوں میں کشتیاں تیرنے لگیں۔ حکام اب بھی مطمئن تھے کہ مسئلہ کچھ زیادہ سنگین نہیں ہے۔ ایک دو دن میں پانی خشک ہو جائے گا۔ حکام کا یہ سوچنا اتنا کچھ غلط بھی نہ تھا کہ ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر اس سے بہتر سوچا بھی کیا جا سکتا تھا!

حیدر آباد میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر نے نکاسئ آب کے لئے دو تین پمپ لگا رکھے تھے۔ اس "موثر" انتظام کے بعد بھلا پانی رکنے کا کیا جواز تھا۔ پانی میں گھرے شہریوں نے جمعیت العلما پاکستان کے لیڈر احمد یوسف کو گھیرا ؤ کیا کرتے۔ ایڈمنسٹریٹر بلدیہ کرنل حبیب کو لے کر معائنہ پر نکلے۔ پتہ چلا پمپ کام نہیں کر رہے۔ بلدیہ نے پمپ نہ چلنے کا الزام واپڈا پر دھرا کہ انہوں نے پاور سپلائی نہیں کیا۔ واپڈا کوئی معمولی ادارہ تو ہے نہیں۔ اس کے سربراہ بھی خیر سے میجر جنرل ہیں۔ پھر اس کا عملہ بھیگی بلی کیوں بنتا۔ جواب تیار تھا کہ بارش سے ٹرانسفارمر بھیگ گیا۔ خیر اب تو بارش ہوئی تھی۔ واپڈا تو ایسا سفید ہاتھی ہے جس کی آنکھ مچولی سال کے بارہ مہینے جاری رہتی ہے۔ بجلی فیل ہونے کی وجہ ہمیشہ اس کے پاس رہتی ہے۔ بات سول انتظامیہ سے فوجی حکام تک پہنچی۔ جنگی بنیاد پر کام شروع ہوا۔ تب بھی برساتی پانی خشک کرنے میں تقریباً دو ہفتے لگ گئے۔

اس دوران وزارتی حلف اٹھانے میں تاخیر کی

بنا پر کچھ وقت پروفیسر غفور کو بھی ملا۔ آئے، ایک عدد پریس کانفرنس کی برسات کا پانی جمع ہونے میں خفیہ ہاتھ تلاش کرنے کی لاتن دے کر واپس ہوتے۔ ادھر سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق بھی بلوچوں سے اپنے چھ روزہ مذاکرات مکمل کر کے کراچی آئے۔ کراچی آنے کے بعد حیدر آباد پہنچنا ضروری تھا۔ آتے اور حکام کی فرض شناسی اور "اعلیٰ خدمت" کا بہ نفسِ نفیس مشاہدہ کیا اور حکام کی لگن اور جانفشانی پر اپنے اطمینان اور پسندیدگی کا برملا اظہار کر کے حیدر آباد کے حکام کو سکھ کا سانس لینے کا موقع دیا۔ حیدر آباد کی انتظامیہ نے ائیرپورٹ پر ہی پریس کانفرنس کا اہتمام کر لیا تھا۔ لیکن کانفرنس میں تمام صحافیوں کو بلانا مصلحت کے خلاف تھا۔ محکمہ اطلاعات کے حکام نے وفاداروں کی فہرست مرتب کی۔ برسوں کے جانے پہچانے صحافیوں خصوصاً بے ریا صحافی خطرناک سمجھے گئے۔ چُن چُن کر جی حضوریئے جمع کئے گئے۔ تعداد بڑھانے کے لئے میڈیکل اسٹوروں کے مالکوں اور دکانداروں تک کو جمع کیا گیا۔ جنرل صاحب کی پریس کانفرنس کی رُوداد تو آپ پڑھ چکے ہوں گے۔ جنرل صاحب نے دیگر باتوں کے علاوہ ایک بہت اچھی بات یہ کی کہ لوگوں کو حکومت پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی مشکلات خود حل کرنے کی تلقین کی۔ بات واقعی درست ہے۔ آخر "امداد" کب تک۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر شہری پانی کی بالٹی یا لیٹ نکالتے تو انہیں حکام کی "بہترین کارکردگی" کے نتیجہ میں دو ہفتے تک پانی میں نہ رہنا پڑتا۔

ابھی جنرل صاحب واپس ہی ہوئے تھے کہ جمعیت العلماء پاکستان کے صدر شاہ احمد نورانی حیدر آباد تشریف لائے۔ حیدر آباد ویسے بھی جمعیت کا "مضبوط قلعہ" ہے۔ خود مولانا نورانی کا حلقۂ انتخاب بھی ہے گلی گلی پھرے۔ متاثرین کو گلے لگا کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ جلدی میں ایک پریس کانفرنس بھی کر ڈالی۔ عوام کی مشکلات کو افسر شاہی کی تساہلی اور نااہلی قرار دیا۔ مولانا نورانی کے مطابق نوکر شاہی بے لگام گھوڑے کی طرح ملک میں من مانی کرتی پھر رہی ہے۔ نورانی میاں نے افسوس کا اظہار کیا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب نے کھل کر نوکر شاہی کا تحفظ شروع کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں نوکر شاہی مزید بے لگام ہوتی جا رہی

ہے۔ نوکر شاہی ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر اسکیمیں تیار کرتی ہے۔ ان کی نااہلی کے نتیجے میں ہر سال ملک کو اربوں روپوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ملک کی نوکر شاہی پر قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ڈھائی ارب روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ اور یہ کرسی پر بیٹھ کر ہر آنے والے کو اچھائی کی تصویر دکھاتی ہے۔ واپڈا کا بجلی کا نظام گھنٹوں معطل رہا جس کی وجہ سے پمپ کام نہ کر سکے۔ اور جنرل صاحب انہیں سفید ہاتھیوں کی تعریف کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ نورانی میاں نے یہ بھی شکایت کی کہ جنرل صاحب کو دکھلانے کے لئے ان کے دورے کے موقع پر پانی کی نکاسی کے قریب پمپ لگائے گئے۔ لیکن ان کے جاتے ہی پمپ ہٹا دیئے گئے۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ علاج کا بندوبست نہیں ہے۔ شہریوں کو گندا پانی پلایا جا رہا ہے۔ صرف حیدرآباد کے شہریوں کا پندرہ کروڑ سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے۔ انتظامیہ نے پہلے تو بارش سے کسی جانی نقصان سے انکار کیا۔ جب کہ مارشل لاء حکام کو چار اموات کی تصدیق کرنی پڑی۔ افسر شاہی کی اس کھلی دروغ گوئی کے باوجود کسی کارروائی کے بجائے ان کی تعریف کی جا رہی ہے۔

بارش اور متاثرین کی امداد کے سلسلہ میں حکام نے شہر کے متعدد اسکولوں میں امدادی کیمپ قائم کر رکھے ہیں۔ سرکاری سطح پر متاثرین میں امدادی اشیا بھی تقسیم کی جا رہی ہیں لیکن اندرونِ خانہ امدادی اشیا بڑے پیمانے پر خرد برد کی جا رہی ہے۔ بتلانے والے بتلاتے ہیں کہ متاثرین کی امداد کے لئے صرف چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز نے تقریباً چار لاکھ روپے دیئے۔ امدادی کاموں کے لئے سرکاری سطح پر محکمہ سوشل ویلفیئر کے علاوہ ہلالِ احمر اور سول ڈیفنس کی ایجنسیاں قائم ہیں۔ سوشل ویلفیئر تو مکمل سرکاری ایجنسی ہے جب کہ سول ڈیفنس اور ہلالِ احمر نیم سرکاری ایجنسیاں ہیں۔ واقف حلقوں کا کہنا ہے کہ امدادی اشیا کی تقسیم میں سوشل ویلفیئر کے حکام بڑے پیمانے پر خرد برد کر رہے ہیں۔ ایک وارڈن کے مطابق سول ڈیفنس کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سول ڈیفنس کے رضاکار بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھو پانے پر بھلا کیا کرتے۔ لے دے کے ایک ہی حربہ تھا۔ وردی اتار کر گھر بیٹھ گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ امدادی اشیا کی تقسیم کے مسئلے پر ۲ اگست کے اجلاس میں جھگڑا بھی ہوا۔

بارش و سیلاب کے بہتے ریلے میں سرکار نے قرطاسِ ابیض بھی جاری کر دیا ہے۔ لوگ منتظر تھے کہ چونکا دینے والے حقائق سامنے آئیں گے، لیکن نئی بات تو کوئی سامنے نہیں آئی۔ بلکہ گذشتہ ایک سال کے دوران انتخابات کے سلسلے میں جتنا مواد اخبارات کے سینے پر نقش ہو چکا ہے اس میں سے بھی کافی سے زیادہ مواد قرطاس میں شامل نہیں کیا گیا۔ پیپلز پارٹی والوں کا تبصرہ کیا ہو سکتا ہے۔ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ انہیں تو "رد" کرنا ہی تھا اصل تبصرہ تو احتساب کے سب سے بڑے داعی مولانا شاہ احمد نورانی کا ہے۔ مولانا نورانی نے قرطاسِ ابیض کو قرطاسِ اسود قرار دیا۔ مولانا کا کہنا ہے کہ قوم منتظر تھی کہ مارچ الیکشن کی دھاندلیوں میں ملوث نوکر شاہی کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا لیکن اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ انتخابی دھاندلیوں میں ملوث افراد اب تک احتساب کی زد سے محفوظ ہیں۔ "قرطاسِ اسود" میں کالا باغ کے نواب مظفر کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن وہ احتساب کی زد سے محفوظ ہیں۔

مولانا نورانی صاحب نے جنرل ضیاء الحق کو ان کی ۲۵ جون کی تقریر میں شامل خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے خطبے کے اس حصے پر کہ "تم میں جو کمزور ہیں۔ وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ زور آور ہیں۔ اور تم سے جو قوی تر اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ وہ کمزور ہے۔" کی یاد دلاتے ہوتے مطالبہ کیا کہ عظیم تاریخی خطبے کی روشنی میں ان بڑے بڑے نوابوں اور جاگیرداروں کو مارشل لاء کے تحت پکڑیں۔ تاکہ قوم کو معلوم ہو کہ واقعی احتساب ہو رہا ہے نہ کہ انتخابات ٹالنے کے لئے احتساب کا نام لیا جا رہا ہے۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورتِ حال کے بارے میں مولانا کا کہنا ہے کہ ملک میں ہر طرف لاقانونیت ہے آرڈر کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ مسائل میں گھرے عوام کے زرد چہروں پر پانی کی مصنوعی سرخی بری لگتی ہے۔ لیکن دوسری طرف تین ارب چالیس کروڑ کی کاریں درآمد کی جا رہی ہیں۔

صاحبو! بارش اور سیلاب پر بہت کچھ سُنا چکا اب یہ بھی سنتے جایئے کہ اندرونِ سندھ ایک دفعہ پھر علم و ادب پر قدغن شروع ہو چکی ہے۔ دو ہفتے پیشتر حیدرآباد شہر میں کتابوں کی ایک دکان قومی کتاب گھر پر پولیس نے چھاپہ مار کر سندھی زبان میں چھپی ہوئی دس کتابوں کی تقریباً تین ہزار جلدیں ضبط کر لیں۔ دکاندار کو نہ تو کوئی تحریری حکم دیا گیا اور نہ ہی ضبط کی ہوئی کتابوں کی دکاندار کو رسید ہی دی گئی۔ سندھی کتابوں پر نزلہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کہ حکومت ہر سال چھ مہینے کے بعد یہ مشق کرتی

عوامی قرطاسِ ابیض

میجر کی بیوی کا میڈیکل کالج میں داخلہ

"مومنین" کے کارناموں کی شہرت کی "خوشبو" ابھی سے پھیلنے لگی ہے۔ اعلیٰ سطح سے نچلی سطح تک جہاں موقع مل جاتا ہے پنجہ ضرور مارتے رہیں۔ تازہ ترین کارنامہ ایک میڈیکل کالج میں غیر قانونی داخلہ دلا کر انجام دیا گیا ہے۔ اس قصہ کی تفصیلات کچھ یوں بیان کی جاتی ہیں۔ کہ کوئی میجر جعفری نے اپنی بیوی ناہید جعفری کو جنہوں نے ۱۹۷۰ء میں سیکنڈ ڈویژن سے انٹر سائنس کیا تھا ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ دلایا ہے۔ یہ خاتون کسی اعلیٰ سرکاری افسر انور جیلانی کی چہیتی صاحبزادی ہیں ظاہر ہے جب "جڑاؤ چھڑی" اور اثر رسوخ موجود ہو تو بھلا آڑے آنے کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ ورنہ اسی کالج میں اچھے اچھے ذہین لڑکے اور لڑکیاں داخلے کے لئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

اس غیر قانونی داخلے کی تفصیلات کے مطابق ناہید جعفری کے داخلے کے لئے سیکریٹری ہیلتھ کے خصوصی احکامات کے ذریعے ایک اضافی نشست کا انتظام کیا گیا۔

رہتی ہے۔ پچھلی حکومتیں کم از کم یہ ضرور کرتی تھیں کہ کتابوں کی ضبطی کے لئے تحریری احکام تو جاری کرتی تھیں لیکن اب اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جنرل صاحب کے حیدرآباد کے حالیہ دورے کے موقع پر ایک صحافی نے سندھی کتابوں کی ضبطی کی نشاندہی کرتے ہوئے وضاحت کی کہ سندھی کتابیں اردو اور انگریزی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔ اصل کتابوں کو نظر انداز کر کے صرف سندھی ترجمے کی ضبطی بے اطمینانی کا سبب بن رہی ہے۔ بقول شخصے روزے بخشوانے کے چکر میں نماز گلے پڑ گئی۔ ضبط شدہ سندھی کتابوں کو واپس کرنے کے بجائے ۲ اگست کو پولیس نے مذکورہ دکان پر ایک دفعہ پھر چڑھائی کی اور سوویت روس کی چھپی ہوئی بائیس سے زائد اردو کتابوں کی تقریباً پانچ چھ سو جلدیں بھی اُٹھا لے گئی۔ چلیئے اب تو انصاف ہو گیا۔ کوئی یہ تو نہ کہے گا کہ صرف سندھی کتابوں کو ضبط کر کے ناانصافی کی گئی ہے اب یہ اور بات ہے کہ اُردو اور سندھی کی مذکورہ کتابیں بنیادی طور پر انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہیں۔ لیکن انگریزی کتابیں انہیں کون ہاتھ لگائے کہ یہ تو ہماری سرکاری زبان ہے۔ رہی کتابوں کے نفسِ مضمون کی بات، تو اسے کون پڑھے کہ یہ کوئی قصے کہانیاں تو ہیں نہیں یہ تو فلسفہ، معاشیات اور سماجیات کے تکنیکی علوم سے متعلق ہیں۔ سیاست پر پابندی کے بعد سیاست کی "درس" تو غائب ہو چکی ہے اب فقط یاست باقی رہی ہے۔ یاست کے اس دورِ ابتلا میں بھلا علم کی ضرورت بھی کیا ہے۔

صاحبو! ادھر تو یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اور اُدھر لیاقت میڈیکل کالج جامشورو کے فائنل ایئر کے طلباء نے نتائج میں دھاندلی کے خلاف ۳۱ جولائی ۱۹۷۸ء سے "مرن برت" شروع کر رکھا ہے۔ پہلے دن چار طلباء نے بھوک ہڑتال شروع کی۔ اور ہر دن کے ساتھ ساتھ دو دو طلبہ بھوک ہڑتال میں شامل ہوتے گئے۔ اس طرح ایک ہفتے کے دوران ان کی تعداد ایک درجن تک پہنچ گئی۔ دو بھوک ہڑتالی محمد علی جمری اور ممتاز مغل کی حالت نازک ہو چکی ہے۔ گذشتہ روز بھوک ہڑتالی طلباء کی حمایت میں ایل ایم سی کے طلباء نے جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ پولیس کے ٹرک تو کئی دن سے اسپتال کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے ہی۔ لاٹھی چارج میں دیر کیسے ہوتی۔ یونین کے صدر خادم لاکھیر اور متعدد بھوک ہڑتالی طلباء زخمی ہوئے۔ گیارہ طلباء گرفتار ہو چکے ہیں۔ طلباء کا کہنا ہے کہ آخری سال کے نتائج میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کی گئی ہے۔ لہٰذا نتائج کی مکمل چھان پھٹک کی جائے اور ایسے افراد جو اقربا پروری اور بدعنوانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ میڈیکل کے طلباء کے نتائج میں اقربا پروری، جانبداری اور بدعنوانی کی خبر نے شہریوں کو خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر یہ واقعی درست ہے کہ نتائج میں بدعنوانی کی گئی ہے تو یہ صورتِ حال انتہائی سنگین ہے۔ ڈاکٹر انسانی جانوں کا محافظ ہے نتائج میں جانبداری اور بدعنوانی کا الزام کسی عام کلرک پر نہیں ہے۔ بلکہ طلباء کے مطابق* اس "کارِ خیر" میں عبدالغنی صدیقی، راجہ غلام سرور، ایم اے عالمانی، اور آئی ایچ جعفری جیسے پروفیسر شامل ہیں۔ جہاں تک ان ڈاکٹر صاحبان کا تعلق ہے۔ علاج کے معاملے میں بھاری فیسوں کے ذریعے کھال کھینچنے کی شہرت تو ان حضرات کی پہلے بھی تھی لیکن ان سینئر ڈاکٹر حضرات سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ دولت کی طمع میں اتنے نیچے آ سکتے ہیں کہ اب ایسے لڑکوں کے ہاتھوں میں ڈاکٹری کی ڈگریاں تھما دیں گے۔ جو اس کے اہل نہیں ہیں۔ آخر شہریوں نے کیا جرم کیا ہے کہ ان کی زندگیوں سے کھیلنے کے لئے نااہل کو اہل بنایا جا رہا ہے۔ انسانی زندگیوں سے کھیلنے کے لئے عطائی حکیم نیم ڈاکٹر پہلے ہی کیا کم ہیں۔ نااہل کو اہل بنانے سے بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحبان اپنے پرائیویٹ کلینکوں میں کام کرتے ہوئے کمپونڈروں کو ڈاکٹر بنا دیتے۔ کم از کم ہم انہیں ڈاکٹر کا سایہ تو جانتے ہیں۔ نتائج میں جانبداری اور اقربا پروری کی شکایت صرف ہمارا ہی مسئلہ نہیں ہے۔ ملک سے باہر بھی اسے پڑھا جاتا ہے۔ اگر صورتِ حال کی اصلاح نہ ہوئی تو ملک سے باہر ہماری ڈگریوں پر کوئی کیسے بھروسہ کرے گا۔ پروفیسر صاحبان اپنے مفاد میں چاہے جو کچھ کریں لیکن انہیں یہ حق نہیں ملنا چاہیئے کہ وہ شہریوں کی جان سے کھیلنے اور ملک سے باہر ملک کا وقار گھٹانا شروع کر دیں۔

ملک کے مالیاتی اداروں کے ملازمین میں بھی بے چینی بڑھ رہی ہے۔ بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کے ملازمین کے حالاتِ کار اور شرائط ملازمت میں یکسانیت کے سلسلہ میں پہلی کوشش سابقہ دورِ حکومت میں ویج کمیشن کے ایوارڈ کی شکل میں ۱۹۷۵ء میں عمل میں آئی۔ ملازمین کے نزدیک ایوارڈ قابلِ قبول نہیں تھا۔ چنانچہ تحریک چلی۔ پہلا ایوارڈ تین سال کی مدت کے لئے تھا۔ جس کی میعاد ۳۱ دسمبر ۱۹۷۷ء کو پوری ہوئی۔ موجودہ حکومت نے نیا کمیشن مقرر کیا جس نے گذشتہ دنوں ایوارڈ دیا ہے۔ ملازمین کے بقول ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پہلے ایوارڈ میں ملازمین کے ساتھ کی گئی زیادتی کا ازالہ کیا جاتا لیکن صورتحال میں کسی مثبت اصلاح کے بجائے ملازمین کی مشکلات میں اضافہ کر دیا گیا۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان اسٹاف یونین کے صدر ابرار شیخ اور جنرل سکریٹری عبدالرشید خان کے مطابق ملازمین کو ساڑھے تیرہ کروڑ کے مفروضہ اضافی فوائد کا اعلان صرف اعداد و شمار کی بازیگری ہے۔ یہ بات ہر دو عہدیداروں نے گذشتہ دنوں اپنی پریس کانفرنس کے دوران بتائی۔ ایوارڈ کے مطابق نئے پے اسکیل کے تحت تنخواہوں میں حقیقی اضافہ مبلغ چار روپے سولہ پیسے سے چھ روپے چھیاسٹھ پیسے ہوا ہے جب کہ ۱۹۷۵ء کے بعد سے اب تک مہنگائی دگنی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ملازمین کے ہاؤس رینٹ میں پہلے کے مقابلے میں صرف دس فیصد اضافہ کر کے چالیس فیصد کیا گیا ہے۔ جب کہ بڑی تنخواہوں والے

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

جہاں تک ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ اس درسگاہ میں میرٹ اور کوٹے کی بنیاد پر داخلہ دیا جاتا ہے۔ اور ان قواعد و ضوابط کی اتنی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کہ بعض اوقات قابل اور مستحق طلباء اور طالبات بھی داخلہ سے محروم رہ جاتے ہیں، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ناہید جعفری میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ درسگاہ کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں داخلہ ہی نہیں دیا گیا بلکہ ان کے لئے ایک اضافی نشست کا انتظام بھی کیا گیا۔

کیا سکریٹری ہیلتھ، کالج کی انتظامیہ اور خود احتساب کا غلغلہ بلند کرنے والے "مومنین" اس صریحاً دھاندلی کا جواب دینا گوارا کریں گے۔

ہے یہ اذنِ راست گوئی، درد کو درماں کہو
ہر عطائی چارہ گر کو عیسیٰ دوراں کہو
شہریارِ نکتہ پیشہ کو کہو نوشیرواں!
بسملِ تیغِ ستم کو آہوئے رقصاں کہو
ہاں کہو بارانِ رحمت جب وفورِ گریہ ہو
اور ہر زخمِ جگر کو اک گلِ خنداں کہو
ہاتھ میں لو کاسۂ خیرات کر کے کج کلاہ
اور خود کو کیسہ دارِ حاتمِ دوراں کہو
ہر مسا کو صبح سمجھو ہر سحر کو تیرہ شب
ہر شبِ ہجراں کو وصل و قربتِ جاناں کہو
ابلہِ کرسی نشیں کو عقلِ کل کا نام دو!
اور دشتِ عقل و دانش کو بلائے جاں کہو
ہر بُتِ کافر کو گردانو حرم کا پاسباں
اور ہر سرمد کو یارو دشمنِ ایماں کہو
حکم ہے ہر بد گہر کے نام پر گوہر لٹاؤ
دوستو ہر زشت رُو کو یوسفِ کنعاں کہو
خانماں بربادیوں کی تیرگی ہے نعرہ زن
آج ہر مفلس کے گھر کو قصرِ عالیشاں کہو
رقص فرماؤ گلی کوچہ کہ خوں غلطیدہ ہے
ہر قدم فرما تمہارا جس کو تم انساں کہو
یا کسی گوشے میں برنا جا کے بیٹھو مثلِ پیر
ورنہ بن کر طفلِ سادہ شاہ کو عریاں کہو

منہاج برنا
خیرپور سنٹرل جیل ۷۹ء

تحریک آزادی
عوامی جد و جہد

طلبہ
چاہے جان چلی جائے بھوک
سوہنی دھرتی تیرے
بیٹے کب ہوں گے آزاد

شبیہہ الحسن

"سوہنی دھرتی تیرے بیٹے کب ہوں گے آزاد" جوہر میر کی آواز میں بلا کا سوز تھا ... تھی۔ آنے والے کل کا پیغام تھا۔ دشمن اور ... پیغام۔ اس کی نظم کا ایک حصہ ختم ہو چکا ہے۔ حصہ جس میں دھرتی، سوہنی دھرتی پاک وطن کی ... جواب دے گی کہ آزادی کے تیس سالوں میں ... جاگیرداروں، اسلام کے نام نہاد ٹھیکیداروں ... کے لیٹرے بیٹوں نے اس کے سینے پر ... لگاتے ہیں، کس طرح اس کے کوکھ کو ویران ... کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ اور اس ... روح میں غلاظت بکھیری ہے، ناممکن ہے۔

یہ ۱۴ اگست کی پریس کلب کی رات ہے ... کے شامیانے میں بھوک ہڑتالی کارکن بیٹھے ... لان کی کرسیوں پر چند دوست بیٹھے ہوتے ہیں ... مدھم مگر سُر اور لے کے ساتھ سوہنی دھرتی ... بیٹے کب ہوں گے آزاد سنا رہا ہے۔ دوسر ... دوست بھی تالیوں کی دھم میں جوہر کا سا ... ہیں۔ ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ بھوک ہڑتالی ... بھی آہستہ آہستہ اٹھ کر آجاتے ہیں۔ مدھم ... ان کا چہرہ نئے مستقبل کی امید سے دمک ...

صحافت

...ون بچائے گا پاکستان

...ھاری کے مزدور اور کسان

...ک ہڑتال ختم نہیں کروں گا، ناصر زیدی

سوہنی دھرتی کے بیٹے آزاد ہوں گے۔

زنجیریں، بیڑیاں، سلاخیں، قید جرمانے اور کوڑے ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔

اس رات ہم نے جوہر سے متعدد نظمیں، غزلیں اور گیت سنے۔ اُس نے کہا۔ "جبر کی فضاؤں میں میرا ذہن زیادہ تیز چلنے لگتا ہے۔ سوہنی دھرتی والی نظم کا بقیہ حصہ شاید جیل میں مکمل کر لوں"۔ رات زیادہ گذر چکی تھی۔ ہم اس سے اجازت لے کر روانہ ہو گئے اُس نے چلتے چلتے کہا۔ "کل ملاقات ہو گی۔" "ضرور ضرور۔ ریگل چوک۔"

یہ ہماری اور جوہر میر سے پریس کلب میں آخری ملاقات تھی۔ اس سے قبل شام ۵ بجے اخباری صنعت کے کارکنوں، محنت کشوں اور طلبا کے آخری اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جنگ ایمپلائز یونین کراچی کے صدر جناب احمد علی علوی نے کہا کہ "ہم نے کبھی محاذ آرائی کی پالیسی اختیار نہ کی۔ مذاکرات کے دروازے کھلے رکھے تاکہ اخباری صنعت کے کارکنوں کے مسائل افہام و تفہیم سے حل کئے جا سکیں۔ مگر طاقت اور وسائل کے نشہ میں مدہوش سرکاری مشینری نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طاقت، جبر اور تشدد سے تحریک کو کچل دیں گے۔ مگر وہ تاریخ کے دھارے سے ناواقف ہیں زندگی کی مثبت قوتوں کو، چاہے وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہوں برباد نہیں کیا جا سکتا۔ پریس کارکنوں کی جدوجہد کے ہراول دستے میں طلبا اور محنت کش شامل ہو چکے ہیں اور اب تحریک کے روح رواں یہی لوگ ہیں۔ ہم نے چہار دیواری کے اندر پُرامن تحریک جاری رکھی مگر حکومت کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کا ابھی تک کوئی معقول نتیجہ برآمد نہیں ہوا، لہٰذا آج یہاں ہماری آپ کی آخری ملاقات ہے۔ کل یہ تحریک سڑک پر ہو گی۔ انہوں نے برصغیر کی تحریک آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ محنت کشوں اور طلبا کی قربانیوں سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ پاکستان میں مظلوموں کی ہر تحریک میں انہی طبقات نے ہراول دستے کے طور پر کارنامہ انجام دیا اور آج بھی اخباری صنعت کے کارکنوں کی جدوجہد میں مزدوروں، ہاریوں اور طلبا کا گرم لہو شامل ہے۔ میں ان سے اپیل کروں گا کہ وہ آگے بڑھیں اور اس کی قیادت کریں۔ علوی صاحب کی تقریر کے اس حصے پر زبردست تالیاں بجیں۔

آزادئ صحافت کا پندرھواں دستہ وہاب صدیقی کی قیادت میں

وہاب صدیقی ایڈیٹر الفتح ورپورٹ

جلسہ گاہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ تو گویا تحریک چہار دیواری سے باہر نکل رہی ہے اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ سرگوشیاں جاری تھیں۔ جلسہ گاہ کی دیوار سے لگے ہوئے سادہ وردی والے چونک پڑے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے معلومات حاصل کیں اور نوٹ بکیں، پنسلیں اور کاپیاں بند کر کے وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ انہیں اطلاع دینی تھی کہ حکمت عملی تبدیل ہو چکی ہے۔

اسی رات کو تیرھویں دستے کے بھوک ہڑتالیوں کو جن میں محمد ریاض بھٹی مساوات لاہور، مسعود قمر

جوہر میر کی قیادت میں حکیم درانی عبدالوحید شیخ محمد یوسف سومرو اور نفیر خاصخیلی

دعوت عمل لائل پور، غلام رسول زنگیجو، آفتاب حیدرآباد
ملک اکبر، لیبر آرگنائزنگ کمیٹی، محمد سلیمان لنڈ، سندھ
ہاری کمیٹی، جبار خٹک سندھ این ایس ایف کراچی
شامل تھے، گرفتار کر لیا گیا۔

اس سے قبل بارھویں دستے میں ناصر زیدی نوائے
ملتان، پربھات کراچی، سلیم شاہ مساوات لاہور، بشیر
بھٹی اعلان سکھر، عبدالکریم سن کراچی، اسماعیل مانڈرا
پاکستان ورکرز فیڈریشن، علی محمد سومرو، ہاری کمیٹی ٹھٹہ
سید اشرف خان، طالب علم ڈی ایم سی، شامل تھے۔ گرفتاری
سے قبل دبلے پتلے، مرنجان مرنج ناصر زیدی کی حالت بگڑ
گئی تھی۔ تیز بخار کے ساتھ اس کا حلق بند ہو گیا تھا۔ اسے
[illegible] ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے
اسے فوراً طبی امداد دی۔ اور گلوکوز کی بوتل چڑھائی۔ ناصر
زیدی سے اپیل کی گئی کہ وہ بھوک ہڑتال ختم کر دے مگر
اس نے انکار کر دیا۔ اس نے جواب دیا "بھوک ہڑتال ختم
نہیں کروں گا چاہے جان چلی جائے۔"

پولیس ناصر زیدی کی تلاش میں ہسپتال پہنچ گئی
اس کے پاؤں میں بیڑی ڈال کر پلنگ سے باندھ
دیا۔ ڈاکٹروں نے اس غیر انسانی سلوک پر شدید احتجاج
کیا مگر پولیس بے سُدھ ناصر زیدی کو اسی حالت میں
گرفتار کر کے لے گئی۔ اس فرض کی ادائیگی پر ہمارے حکام
یقیناً انعام و اکرام اور ترقی کے مستحق قرار دیے جا سکتے
ہیں کیوں کہ انہوں نے انسانی ہمدردی کے ڈھکوسلے
کی خاطر فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

۵ اگست کی شام ہے۔ ریگل چوک پولیس اور سادہ
وردی والوں سے پٹا پڑا ہے۔ ٹریفک کی آمدورفت جاری
ہے۔ چہل پہل اور وہی رونقیں ہیں۔ خریداری بھی ہو
رہی ہے اور ساتھ ساتھ تفریح بھی۔ متعدد شناسا چہرے
نظر آتے ہیں۔ ہم کیفے جارج کے سامنے ایک ذرا دیر
کے لئے رکتے ہیں۔ سی آئی ڈی کے دو افراد کندھے سے
کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھ جاتے ہیں
ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ اخباری صنعت کے کارکن، مزدور
ہاری اور طالب علم کسی جگہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش
کریں گے، اوڈین سینما کے سامنے پولیس کی بڑی وین
کھڑی ہے۔ کتابوں کے بک اسٹالوں کے قریب ایس پی،
ڈی ایس پی اور پولیس کا جتھا شکار کی تلاش میں ہے۔
قریب ہی جماعت اسلامی کے اخبار جسارت کا کرائم رپورٹر
کھڑا تھا۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ مخبری کی علیحدہ
سے فیس وصول کرتا ہے۔ یہ بات ہمارے لئے باعث حیرت
تھی کہ وقت اور جگہ کا صحیح علم تو ہمیں بھی نہیں تھا۔ پھر
جسارتی کرائم رپورٹر کو کیسے ہو گیا؟

ٹھیک سوا پانچ بجے فریئر روڈ کی جانب سے
ریگل اسٹاپ پر پہنچنے والی بس سے اخباری کارکن،
مزدور، کسان اور طلبہ کے نمائندے اترتے ہیں۔ ان
کے گلے میں ہار پڑے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں
میں بینر اٹھا رکھے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے "مہنگائی ختم
کرو" اخباری کارکنوں کے آٹھ نکاتی مطالبات تسلیم کرو،
پریس کو آزاد کرو، کارخانوں سے چھانٹیاں بند کرو،
طلبہ کے مسائل حل کرو، کسانوں کی بیدخلیاں بند کرو"۔
پولیس اور سادہ وردی والے ان پر خونخوار گدھ کی طرح
ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مجھے جوہر میر نظر آتا ہے، جو کل سے بالکل

پریس کلب میں بھوک ہڑتال پر بیٹھنے والے حبیب الرحمٰن امجد قلندر بخش اور اکرام قائم خانی

مختلف ہے۔ کل شاعر تھا۔ آج وہ اپنے شعروں کی عملی تفسیر تھا، متحرک، چاق و چوبند اور سرگرم۔ سوہنی دھرتی کے بیٹے حقیقی آزادی کے لئے سرگرم عمل تھے۔ نوجوان محاذ کے کلیم درانی، سندھ ہاری کمیٹی کے رکن بصیر خاصخیلی، مساوات لاہور کے عبدالوحید شیخ، آفتاب حیدرآباد کے محمد یوسف سومرو، مساوات کراچی کے محمد سرور پر چاروں طرف سے پولیس والے ٹوٹ پڑے تھے، مگر وہ ان کے بازوؤں سے پھسل کر پُرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ "جدوجہد تیز ہو۔" اتنی دیر میں وہاں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے گرفتار ہونے والے کارکنوں کے نعروں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ "ظلم کے خلاف جدوجہد تیز ہو۔" کے خلاف جدوجہد تیز ہو۔"

لوگ حیران تھے کہ یہ کون سرپھرے لوگ ہیں جو کھلے عام ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ یہ صحافی ہیں، پریس کے کارکن ہیں، مزدور ہیں، کسان ہیں، طلبہ ہیں، یہ لوگ ملک کے دل و دماغ ہیں، خون ہیں، جسم ہیں، ریڑھ کی ہڈی ہیں، "کون بچائے گا پاکستان، طلبہ ہاری مزدور کسان۔"

پولیس نے دس پندرہ منٹ کے دوران جوہر میر، کلیم درانی، بصیر خاصخیلی، عبدالوحید شیخ، محمد یوسف سومرو، اور محمد سرور کو جنہوں نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا تھا، جان توڑ مشقت کے بعد گرفتار کر لیا۔ جوہر میر اور کلیم درانی کھلی وین میں بھی بار بار کھڑے ہو کر نعرے لگا رہے تھے۔ اور جمِ غفیر ان کے نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ "صحافی، طلبہ، مزدور کسان اتحاد۔ زندہ باد۔"

۱۷ اگست کی صبح کو وہاب صدیقی سے ملاقات ہوئی ہشاش بشاش، نکھرا نکھرا۔ خلافِ معمول کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کے ہونٹوں کی جو مسکراہٹ مٹ چکی ہے۔ پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی، نیلگوں کرتہ شلوار، جیبوں میں ریڈ اینڈ وائٹ کے سگریٹوں کے پیکٹ، اس نے دھواں اگلتے ہوئے کہا۔ کرتہ ہے پورا۔

"اچھا تو آج آپ کے ارادے کچھ نیک معلوم ہوتے ہیں۔ چلو کچھ دن تو فرصت کے لمحات مل جائیں گے۔ واحد بھائی سارے بکھیڑوں سے نمٹتے رہیں گے۔"

شام کے وقت ریگل چوک پر کافی رش تھا۔ کل کے واقعہ کے بعد یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ اخباری صنعت کے کارکن، طلباء، مزدور اور ہاری اپنے مطالبات کی حمایت میں روزانہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کریں گے۔ اس ہجوم میں طلباء، مزدور، سیاسی کارکن اور عام لوگ شامل تھے۔ خواتین کی بھی خاصی بڑی تعداد نظر آئی۔ گزشتہ روز کی نسبت آج پولیس کا انتظام کچھ زیادہ وسیع اور منظم تھا۔ پورے علاقے میں پولیس نے اپنے کارندوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ چپہ چپہ پر شلوار کرتے اور کندھے پر جھاڑن ڈالے خفیہ پولیس والے گھوم رہے تھے۔ عوام اور پولیس دونوں مجاہدینِ صحافت کے منتظر تھے۔ اپنے اپنے طور اور انداز سے۔ ریگل اسٹاپ پر جو بھی بس رکتی، پولیس والے اندر گھس کر بھوک ہڑتالیوں کی تلاشی لیتے۔ لیکن انہیں بڑی مایوسی ہوتی۔ پولیس کے اعلیٰ افسران ادھر ادھر بوکھلائے گھوم رہے تھے۔ شاید مخبری نہ ہو سکی تھی کہ بھوک ہڑتالی کس سمت سے آنے والے ہیں۔ اچانک ایک جانب سے الفتح کے مدیر وہاب صدیقی کی قیادت میں جھڈو میں نمائندہ عبرت ہوت لغاری، سکھر میں نمائندہ ہلال پاکستان غلام محمد جتوئی، مساوات لاہور کے محمد عظیم، لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کے ملک حق نواز اور سندھی ہاری کمیٹی کے یعقوب کیرانو نمودار ہوئے۔ پولیس والے بڑے حیران ہوئے کہ یہ لوگ اچانک کہاں سے نکل آئے۔ سیٹیاں بجنے لگیں۔ پولیس گاڑیوں کے رُخ تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ اس مرتبہ ہڑتالیوں کے سواگت کے لئے دو بڑی گاڑیاں لائی گئی تھیں۔ ایک پرانی جگہ یعنی اوڈین کے بالمقابل تھی۔ دوسری فریئر روڈ پر تھی۔ کارکنوں کے گلے میں ہار پڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں پلے کارڈز تھے جن پر ان کے مطالبات درج تھے۔ "صحافیوں کے آٹھ نکاتی مطالبات پورے کرو۔ مہنگائی ختم کرو، مزدوروں کسانوں کی چھانٹیاں اور برطرفیاں بند کرو۔ طلبہ کے مسائل حل کرو۔" پولیس کا سب سے پہلا ہلّہ بینروں اور پلے کارڈوں پر ہوا۔ انہیں چھیننے کے بعد گرفتاری کے لئے پیش کرنے والے کارکنوں کو گرفتار کر کے گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا۔ اس دوران وہاں عوام کا زبردست ہجوم جمع ہو گیا۔ جو گرفتار کارکنوں کے نعروں کا بڑے جوش و خروش سے جواب دے رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے ٹریفک کی آمد و رفت معطل ہو گئی۔ بسوں سے لوگ اتر کر کارکنوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔

ظلم کے خلاف جدوجہد تیز ہو۔

صحافیوں کے آٹھ نکات تسلیم کرو۔

محنت کشوں کی چھانٹیاں، برطرفیاں اور بیدخلیاں بند کرو۔

مہنگائی ختم کرو۔

جدوجہد۔ جدوجہد۔ تیز ہو۔

وہاب صدیقی، جو بڑے کام کا آدمی ہے اور جس کے سر پر ہر وقت کام کا بھوت سوار رہتا ہے۔ ایک بڑے اور عظیم کام پر چلا گیا۔ اس سے قبل بھی لاہور موومنٹ کے دوران پہلے دستے میں شامل ہوا تھا، مگر تیسرے دن اسے طیارے پر سوار کرا کر پنجاب بدر کر دیا گیا تھا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ اس بار اسے کوئی افسوس نہ ہو گا، بلکہ خوشی ہو گی۔ بھرے پرے بازار میں نر بچے کی طرح گرفتار ہوا ہے۔ البتہ مجھے یہ فکر ضرور ہے کہ حوالات اور اس کے بعد جیل کے طویل دن اور راتوں میں وہ نچلا کیسے بیٹھے گا۔ کس پرچے کو ترتیب دے گا۔ گھوم گھوم کر سگریٹوں کا دھواں کیسے اگلے گا۔

پی ایف یو جے اور ایپنک کی صفوں میں ایسے نر بچوں کی کمی نہیں، انہیں ۲۰ ہزار کی تھیلی سے نہیں خریدا جا سکتا۔ وہ جس نصب العین کے لئے پُرامن جدوجہد کر رہے ہیں اس کے بارے میں بہت واضح ہیں۔ اتنے کلیئر کہ وہ بہت دور اپنی کامیابی کی جھلک آج ہی دیکھ رہے ہیں۔ ◎◎

روئی کی تجارت ہیرا پھیری اور سٹہ بازی

روئی کی برآمدی تجارت کو نجی شعبے میں دینا ترقی معکوس ہو گا!

ابن الحسن

پچھلے چند مہینوں سے پرائیویٹ سیکٹر کے لال بجھکڑ اخبارات کے ذریعے اور مختلف طریقوں سے رٹ لگا رہے ہیں کہ روئی کی برآمدی تجارت میں پرائیویٹ سیکٹر کو حصہ دار بنایا جائے یہ لوگ بار بار جس بات کی وکالت کر رہے ہیں اگر اس کا صحیح تجزیہ کیا جائے تو اس کا مطلب

یہ نکلتا ہے کہ وہ ترقی معکوس کر کے ۱۹۷۳ء کے پہلے کا دور واپس لانا چاہتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کے یہ اہل خردجوردئی کی تجارت، ہیرا پھیری، سٹہ بازی اور برآمد سے ہر سال دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے تھے ۱۹۷۳ء کے بعد کی صورتحال کو الٹ دینے کے لئے خوشنما الفاظ سے کھیلنے پر مجبور ہیں۔

اس معاملے میں ملکی اقتصادیات کے بہترین مفاد میں غور کرنا اور کپاس کے کاشتکاروں کو استحصال سے بچانا حکومت کا کام ہے میں صرف ۱۹۷۳ء سے قبل کے حقائق پر روشنی ڈالوں گا اور پھر ۱۹۷۶ء میں کپاس کی پھٹی اور سوت کی قیمتیں مقرر کرنے کی وجوہات بیان کروں گا انہیں یکجا کر کے صحیح نتائج اخذ کرنا پھر کرتا دھرتاؤں کا کام ہوگا۔

۱۔ ۱۹۷۶ء سے قبل حکومت نے پھٹی کپاس اور بنولے کی قیمتیں مقرر نہیں کی تھیں قیمتیں چڑھتی اترتی رہتی تھیں اور وہ بھی دن میں کئی بار، اس کا کسے علم نہیں ہے کہ کاشتکاروں کو ان پڑھ ہونے کی بنا پر اور فصل کی کٹائی یا تجارتی منڈی میں کوئی تحفظ حاصل نہ ہونے سے کمزور ترین ہونے کے باعث سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا

۲۔ جننگ فیکٹریوں کا تومیائے جانا مذہبی طور پر درست نہیں سمجھا گیا کہ فیکٹریاں نجی ملکیت تھیں لیکن اگر آپ کاشتکاروں سے پوچھیں تو وہ بتائیں گے کہ جننگ فیکٹریوں کے تومیائے جانے کے بعد کہیں جا کر انہیں پھٹی کی مقرر کردہ قیمت وصول کرنے کی آزادی نصیب ہوئی تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جننگ فیکٹریوں کو انکے مالکان کے حوالے کرتے ہوئے کاشتکاروں کے تحفظ کا متبادل راستہ کیا ہو؟ اس کا واحد جواب یہ ہے کہ سال بھر پھٹی کی ایک ہی مقرر کردہ قیمت رکھی جائے جس سے اس میں اتار چڑھاؤ پیدا نہیں ہو۔

۳۔ یہی صورت سوت کی بھی ہے کہ اس کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ سے کاشتکار، فیکٹریوں اور ملوں کے مالکان اور برآمد کنندگان سب ہی متاثر ہوتے ہیں اور سب لوگ تو کسی کسی طرح منافع کما ہی لیتے ہیں لیکن کاشتکاروں کا پرسانِ حال کوئی نہیں کہ انہیں خرید و فروخت کے معاملے میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے لہٰذا اس مسئلے کا حل بھی یہی ہے کہ سال بھر سوت کی ایک ہی قیمت رکھی جائے۔

۴۔ وعدہ بازار اور خرید و فروخت محض ایک سٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ صرف کاغذی خرید و فروخت اصل پیداوار سے کئی گناہ زیادہ ہوتی ہے سرمایہ کار صرف کراچی کاٹن ایسوسی ایشن کے وعدہ بازار پر کاغذات میں ایک جوئے کے طور پر خرید و فروخت کرتے تھے اور اس طرح منافع کماتے تھے کہ وعدہ بازار والے کارپرداز والے بڑے بڑے تاجروں کے مفاد میں کاغذات پر جعلی خرید و فروخت دکھا کر قیمتوں کو بڑھاتے گھٹاتے تھے کیا کے سی اے کو دوبارہ اجازت دی جائے کہ وہ وعدہ بازار اور مصنوعی خرید و فروخت شروع کر دے اور اس طرح ان کارپردازوں کو جوا چلانے کا موقعہ فراہم کرے اس سوال کا واحد جواب یہی ہے کہ اسلام کسی شکل میں بھی جوئے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

۵۔ دنیا میں کپاس پیدا کرنے والے ملکوں کی تعداد ۸۰ ہے لیکن ۷۹ میں وعدہ بازار اور مصنوعی خرید و فروخت کا طریقہ نہیں ہے امریکہ وہ واحد ملک ہے جہاں اس کے حسب ذیل مخصوص حالات کی بنا پر یہ طریقہ رائج ہے۔

(الف) امریکہ کے کاشتکار باشعور ہیں ان کے بڑے بڑے یونٹ ہیں مالی اعتبار سے مضبوط ہیں اور وعدہ بازار کرنے میں ان کا عمل دخل ہے۔

(ب) امریکہ میں حسب توقع قیمت، قرضوں کی صورت میں وصول ہونے والی قیمت اور اوسط قیمت کا طریقہ کار کاشتکاروں کے تحفظ کی خاطر خاصا پیچیدہ ہے جسے کوئی چھوٹا اور ترقی پذیر ملک اپنا نہیں سکتا۔

(ج) امریکہ نہ صرف دنیا بھر میں سب سے زیادہ کپاس برآمد کرتا ہے بلکہ دنیا کا امیر ترین ملک بھی ہے لہٰذا اس کی اپنے خریدار ملکوں پر تقریباً بالادستی ہے۔

(د) امریکی جس طرح شراب نوشی کو معیوب نہیں سمجھتے اسی طرح جوئے کو بھی عیب نہیں سمجھتے۔

۶۔ جننگ فیکٹریوں کا قومیانہ جانا اور روئی کی برآمد کو قومی تحویل میں لینا دو مختلف چیزیں ہیں۔ جننگ فیکٹریاں نجی ملکیت میں تھیں جبکہ کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن ۱۹۷۳ء میں مرکزی وزارت تجارت کی سرمایہ کاری سے قائم کی گئی تھی حکومت کی روئی کی برآمد کے کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لینے کی وجوہات بہت سی ہیں اور محتاج بیان نہیں ہیں کیونکہ ۱۹۷۳ء سے قبل برآمد کے معاملے میں ہونے والی بداعمالیوں سے سب واقف ہیں۔

۷۔ پھٹی اور سوت کی شرح مقرر ہو جانے سے کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن پر اجارہ داری کا الزام غلط ثابت ہو جائے گا۔ زیادہ تعداد میں برآمد کنندگان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ غیر ملکی مارکیٹ میں مسابقت کے باعث قیمتیں کم ہو جائیں گی۔ اس صورت میں ۱۹۷۳ء سے قبل کے حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے روئی کی برآمد حکومت کے ہاتھوں میں ہی رہے تو بہتر ہے ایک مرتبہ کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن نے دیسی روئی کی قیمت ۱۲۶ سینٹ فی پونڈ حاصل کر کے پاکستان کی تاریخ میں ریکارڈ قائم کیا تھا۔

۸۔ ۱۹۷۲ء تک پرائیویٹ سیکٹر کی بدعنوانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بیرون ملک مقررہ کوالٹی کی بجائے گھٹیا کوالٹی کی روئی بھیجی گئی غیر ملکی خریداروں کے ساتھ کیا گیا معاہدہ توڑ دیا گیا ان کی رقم ہضم کر لی گئی یا ادائیگی میں تاخیر کی گئی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ پاکستان کی بدنامی کی صورت میں نکلا۔ اور بیرون ملک روئی کی کھپت میں رخنہ پڑ گیا۔ یہ کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن ہی تھی جس نے بیرون ملک پاکستان کا کھویا ہوا وقار بحال کیا اور غیر ملکی خریداروں کو پاکستان کی روئی بخوشی خریدنے پر راغب کیا۔

۹۔ پرائیویٹ سیکٹر کے برآمد کنندگان روئی برآمد کرنے کے علاوہ اور بھی کاروبار کرتے تھے۔ یہ بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں اور انہوں نے ۱۹۷۳ء میں کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن کے قیام کے بعد اپنے اپنے کاروبار کو پھیلا لیا ہے یا کوئی نیا کاروبار شروع کر لیا ہے اب ان کا روئی برآمد کرنے کے کاروبار میں اپنی سابقہ بداعمالیوں سمیت لوٹ آنا ملکی مفاد میں نہیں ہوگا

۱۰۔ یہ حضرات اس کاروبار میں لوٹ آنا پسند نہیں کرینگے بشرطیکہ۔

۱۔ پھٹی کی قیمت تمام سال ایک ہی ہے۔
۲۔ سوت کی قیمت سال بھر ایک ہے۔
۳۔ سٹہ بازی کے طور پر روئی کا بازار کا بھاؤ بند کر دیا جائے۔
۴۔ انہیں برآمد پر دل کھول کر منافع نہ ملے
۵۔ غیر ملکی فرموں سے معاہدہ کر کے مکر جانے کے مواقع نہ ہوں
۶۔ غیر ملکی تاجروں کی رقوم ہضم کرنے کی کھلی چھوٹی نہ ہو۔

◎◎

غداران صحافت پر ستر ہزار روپے خرچ کئے گئے

رشید چوھدری نے لاھوری بادشاہ کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا

ہیرالڈ پریس میں محمود شام

احمد علی خاں اور غلام نبی

مغل پر غنڈوں کا حملہ

نمائندہ خصوصی

موجودہ غیر نمائندہ اور غیر منتخب حکومت اس کوشش میں ہے کہ ہر منتخب ادارے اور تنظیم کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دے۔ چنانچہ اِن دِنوں صحافیوں اور پریس کارکنوں کی منتخب تنظیمیں، پی ایف یو جے اور اپنک حکومت کی نگاہوں میں خار بن کر کھٹک رہی ہیں۔ جماعت اسلامی بھی ایک عرصہ سے ان تنظیموں کو تہہ خاک کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

لہذا اِن دنوں فوجی حکومت اور جماعت اسلامی دونوں نے مل کر پی ایف یو جے اور اپنک کیخلاف محاذ گرم کر رکھا ہے۔ اِن کا ارادہ یہی ہے کہ غداروں کو پیسے کھلا کر ان جمہوری تنظیموں کو دھڑوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے محمود جعفری، رشید صدیقی، نسیم الحق عثمانی اور رشید چودھری جیسے موقع پرستوں کو خریدا گیا۔ ان کے ذریعہ اپنک اور پی ایف یو جے میں دھڑے بندی کی سازش کی گئی۔ نسیم الحق عثمانی کی قیادت میں نام نہاد اپنک کراچی کا کنونشن "مسلم جمیخانہ" میں کرایا گیا جس میں جسارت کے مکمل اسٹاف سے کرسیاں بھرنے کی ناکام کوشش کی گئی کنونشن کے سارے اخراجات سندھ کے محکمہ اطلاعات اور جماعت اسلامی نے ادا کیئے۔ تاہم بعض وفاقی حکام نے اس بات پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا کہ کنونشن کسی اخبار کے دفتر میں کرانے کی بجائے جمیخانہ میں کیوں کروایا گیا۔ اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ کنونشن کو جس پر حکومت کے ہزاروں روپے ہوئے اخباری صنعت کے کارکنوں کی حمایت حاصل نہ تھی۔

بعدازاں صوبائی سیکریٹری اطلاعات سندھ یوسف جمال نے جو آج بھی نجی محفلوں میں ترقی پسندی کا دعویٰ کرتے ہیں اور فیض احمد فیض کے اشعار پر سر دھنتے ہیں نسیم الحق عثمانی ٹولے سے نیا پریس کلب دینے کا وعدہ کیا۔ اور ہماری اطلاعات کے مطابق وائلڈ لائف کے چند کمرے انہیں الاٹ بھی کر دیئے گئے۔ مگر اس ٹولے نے انگوٹھا چوستے ہوئے کہا کہ نہیں ـ نہیں ہمیں تو پبلک سروس کمیشن کی عمارت چاہیئے۔ اس ہاں ـ ہاں اور نہیں نہیں میں سنا گیا ہے یوسف جمال اپنا سر پکڑے، مُنہ چھپائے گھوم رہے ہیں، کیوں کہ پبلک سروس کمیشن کی عمارت کا الاٹ منٹ ان کے بس سے باہر ہے۔ تاہم وعدہ وعدہ ہے اور یہ وعدہ اس شرط پر کیا گیا کہ منتخب اپنک کی جگہ جعلی اپنک قائم کی جائے گی۔ جس کے سرغنہ نسیم الحق عثمانی اور رشید چودھری عرف گامے پہلوان ہوں گے۔ گامے پہلوان اس معنیٰ میں کہ انہوں نے اب لاہوری بادشاہ کا رول ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ نمونے کے طور پر اپنے گھر یعنی ہیرالڈ کے دفتر میں محمود شام، احمد علی خان اور غلام نبی مغل کو زدوکوب کرایا۔ اور بڑے زور سے بڑک ماری تھی۔

نام نہاد اپنک کنونشن سے فارغ ہونے کے بعد گذشتہ دنوں "غداروں اور بے ضمیروں کا ٹولہ" بی ڈی ایم اجلاس کے لئے پشاور گیا۔ اس ٹولے کے قریبی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پشاور بی ڈی ایم کے اجلاس کے لئے دس ہزار کی خطیر رقم کی تھیلی دی گئی تھی جس کی ابتدائی تقسیم پر آپس میں کچھ بدمزگی بھی ہوئی۔ یہ نام نہاد ٹولہ علی کبیر، بدر جالنوی اور خالد بٹ اور اقبال مرزا دھڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے بعد میں نسیم الحق عثمانی نے یہ کہہ کر عارضی تصفیہ کرا دیا کہ بچ رہنے والی رقم برابر برابر تقسیم کر دی جائے گی۔ اگر ابھی سے جھگڑا شروع ہو گیا تو ساری اسکیم دھری کی دھری رہ جائے گی۔"

پی ایف یو جے اور اپنک کو توڑنے، غداروں کے ضمیر خریدنے منتخب عہدیداروں کے مقابلے میں غیر منتخب لوگوں کو بلا مقابلہ متبادل عہدیدار بنوانے کے لئے سرکاری ادارے نیشنل پریس ٹرسٹ کے ایک علیٰ افسر نے مبینہ طور پر ستر ہزار روپے خرچ کئے ہیں۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ لاہور میں پی ایف یو جے کے صدر منہاج برنا کی قیادت میں بھوک ہڑتال کے بعد نوکر شاہی نے مسٹر برنا اور ان کے ساتھیوں کی جگہ توڑ جوڑ اور سازشوں کے ذریعہ اپنے من پسند افراد کو دینے کا پروگرام بنایا تھا جس پر عملدرآمد کے لئے پہلے مرحلہ میں ٹوڈی صحافیوں کا ایک غیر نمائندہ وفد حکومت سے مذاکرات کے لئے منتخب کیا گیا جس کے بعد اپنک اور پی ایف یو جے میں ان بکاؤ افراد سے توڑ پھوڑ کا عمل شروع کرایا گیا۔ ملک میں پی ایف یو جے کے مختلف شہروں کے یونٹوں کی سطح سے بھی یہ کام شروع کیا گیا۔ جس کے بعد ملک گیر سطح پر پی ایف یو جے کی قیادت پر قبضہ کرنے کے لئے ستر ہزار روپے خرچ کر کے پی ایف یو جے کے جعلی عہدیدار بلا مقابلہ منتخب کرائے گئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ستر ہزار روپے کے لگ بھگ رقم صرف مرکزی عہدیداروں کا ڈھونگ رچانے پر خرچ کی گئی۔ پی ایف یو جے میں توڑ پھوڑ کی ذمہ داری لینے والے صحافیوں پر جو دیگر رقومات خرچ کی گئیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس میں جو پی ایف یو جے کا ایک یونٹ ہے۔ یہی ڈرامہ رچانے کی کوشش کی گئی، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس کی تاخیر ہو گئی جس کی وجہ سے آر یو جے کے بلا مقابلہ عہدیدار نامزد نہیں کئے جا سکے۔ ستر ہزار روپے کی جس رقم کا انکشاف ہوا ہے وہ جمیل الزمان جیسے افسر اپنی جیب سے خرچ نہیں کر سکتے"۔

ایک طرف حکومت، اس کا زرخرید ٹولہ اور بے پناہ وسائل ہیں، دوسری جانب ایثار اور قربانی کے جذبے سے سرشار وہ صحافی اور پریس کارکن ہیں جن کے پاس وسائل تو نہیں ہیں، لیکن انہیں ملک کے محنت کشوں اور طلباء کا ناقابلِ شکست تعاون اور حمایت حاصل ہے۔ اور انہیں یقین ہے کہ وہ اس "ہتھیار" سے لوہے اور فولاد کے بنے تمام ہتھیاروں اور شرمناک عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔

داستان جد و جہد ۴

علی احمد خاں

> جیلوں کی حفاظت کرنے کی بجائے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے کام کیا جاتا تو جیلوں کی ضرورت نہ پڑتی

ہم الجھے ہوئے اون کو سلجھا رہے تھے اور حکمراں سلجھی ہوئی چیزوں کو الجھانے میں مصروف تھے

جیل میں "روٹی، کپڑے اور مکان" کا مسئلہ حل ہوگیا

۱۱ مئی غالباً بدھ کا دن تھا۔ گھوم پھر کر بیرک اور اس کے گرد چہار دیواری کا معائنہ کیا۔ سامنے وہ اونچی والی چہار دیواری تھی جو پورے جیل کا احاطہ کیے ہوئے تھی اس پر ایک مچان بھی بنا ہوا تھا جس پر ہر وقت دو سپاہی بیٹھے نہ جانے کیا کرتے تھے کچھ لوگوں نے بتایا کہ پہرہ دیتے ہیں کہ کہیں کوئی باہر نہ نکل جائے میں نے بیرک کی چہار دیواری اور پھر اس اونچی فصیل کو دیکھا میری سمجھ میں بات آئی نہیں میں نے ایک صاحب جو غالباً ہماری بیرک کے نمبردار تھے اس لیے کہ ان کے سر پر لال ٹوپی تھی دریافت کیا کہ کیا ہم لوگ قیدی ہیں اس نے

علی احمد خاں

حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ہاں صاحب قیدی نہیں ہیں تو ادھر آئے کیسے۔

میں نے کہا "لیکن یہاں آنے کے بعد تو ہمیں حقیقی آزادی ملی ہے۔ سوچنے سمجھنے بات کرنے، ہنسنے بولنے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنے کی، ہم قیدی کیسے

منہاج برنا صدر پی ایف یو جے بہ چیئرمین ایمنک

ہو سکتے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے اس کی سمجھ میں میری بات نہ آرہی ہو۔ میں نے سوچا ان بیچارے سپاہیوں کو کیسا بیوقوف بنایا ہوا ہے۔ جیل کی فصیل کی جس تندہی سے حفاظت کی جاتی ہے اگر اسی تندہی سے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کام کیا جاتا تو شاید ان جیلوں کی بھی ضرورت نہ پڑتی اور اتنے سارے آدمی جو اس اونچی سی فصیل کے اندر قیدی کے نام سے محصور ہیں کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں میں اپنے ملک کو چار چاند لگا رہے ہوتے تیس سال میں یہ ملک ایک مثالی ریاست بن کر دنیا کے سامنے ابھرتا۔ یہاں کے بچے پھولے پھولے گالوں اور خوشنما کپڑوں میں اپنے والدین کی انگلیاں پکڑے ہوئے باغوں اور پارکوں میں ٹہلتے ہوئے نظر آتے۔

طویل سڑکوں پر لوگ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ٹرکوں اور بسوں پر گھومتے پھرتے کارخانوں سے نکلی ہوئی مصنوعات کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہوتا نئی نئی ایجادیں ہوتیں ہم پوری دنیا کے

نثار عثمانی سیکرٹری جنرل پی ایف یو جے

لیے ایک بہتر مستقبل کی ضمانت سمجھے جاتے ہماری شہرت ملکی سرحدوں سے نکل کر دوسرے ملکوں کو متاثر کرتی لیکن بدقسمتی سے تیس سال کے عرصہ میں ہمارے ہاں معیشت کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے بجائے جیل کی فصیلوں کو بلند سے بلند تر کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی۔

سپاہی پر پھر نظر پڑی تو وہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے شاید میرے خیالات کو فصیل کے اس پار جانے سے روک رہا ہو میں غسل خانہ کی طرف بڑھ گیا اس بیچارے

جیل کے قوانین فلاحی ریاست کے تصور کے مطابق بنائے گئے ہیں

سپاہی کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔

جس بیرک میں ہم لوگ تھے اس میں ۲۵ افراد جمع ہو چکے تھے مزید کی گنجائش نہیں تھی اس لیے عثمانی صاحب نے جیلر سے ملاقات کی اور صورتحال سے آگاہ کیا معلوم ہوا دوسری بیرک جو پہلی بیرک کے سامنے تھی کھول دی جائے گی۔

ناشتہ اور چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو شفقت آ گئی اور عثمانی صاحب اپنے جیل کے سوٹ میں جو کھدر کے لٹھے کے سلے ہوئے شلوار کرتے اور ٹوپی پر مشتمل تھا دوسری بیرک کے وارنڈے میں جا بیٹھے شفقت الجھے ہوئے اون کی شکل میں آئی تھی جسے سلجھانا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حفیظ راقب اسلم شیخ، افضل خان، مرزا صاحب وغیرہ سمیت سارے لوگ بیٹھے ہوئے الجھی ہوئی اون کو سلجھانے میں مصروف ہو گئے ہم الجھے ہوئے اون کو سلجھانے میں مصروف تھے اور ہمارے حکمران سلجھی ہوئی چیزوں کو الجھانے میں مصروف تھے کوئی گیارہ بجے یہ سلسلہ ختم ہوا تو پھر کھانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ اس وقت تک گرمی بھی اتنی شدت اختیار کر چکی تھی کہ مجھے نسیم آروی کی کتاب "سوا نیزہ کا سورج" پر بنا ہوا ٹائٹل یاد آنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیرک میں جنگلوں سے اتنی گرم ہوائیں آنے لگیں جیسے ہماری بیرک کسی تندور میں رکھی ہوئی ہو۔

جنگلوں پر کمبل بھگو کر لٹکا دیئے گئے یہ کمبل فی کس دو ملتے تھے ایک بچھانے کے لئے ایک تکیہ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے، تکیے والے کمبل بھگو کر جنگلوں پر لٹکا دیئے گئے جو تین بجتے بجتے ایسے خشک ہو گئے جیسے ان پر پانی کا ایک چھینٹا بھی نہ پڑا ہو جبکہ کراچی میں میری بچی اگر بستر پہ پیشاب کر دیتی تو میری بیوی محض اسلئے اس کی پٹائی کرتی تھی کہ کئی دن اس روئی کے گدے کو سکھانے میں لگ جاتے۔ مجھے گرمی کی یہ ناہموار تقسیم کچھ پسند نہیں آئی۔ ہم نے سوچا اگر جولائی کی پانچ تاریخ کو پکڑے جاتے تو شاید مری میں رکھے جاتے یکم مئی کو تو جو بھی تحریک شروع ہوئی اسے ایسی ہی یا اس سے بھی سنگینوں سے گذرنا پڑا ہے یہ دوسری بات ہے کہ ۵ جولائی میں شروع کی جانے والی تحریک صرف ایک سال چل کر ختم نہیں ہو جاتی ہے اور مئی میں شروع کی جانے والی تحریکیں معطل تو ہو سکتی ہیں لیکن رکتی نہیں ہیں۔

بہر حال تین بجے تک کمبل تو سوکھ گئے' لیکن سورج بھی مغرب کی جانب ڈھل چکا تھا اور بیرک کے سائے بیرک کے وسیع و عریض آنگن میں خاصی دور تک پھیل چکے تھے۔

لوگ بیرک سے نکل کر بیرک کے سائے میں بیٹھ گئے جو نسبتاً "پرسکون جگہ تھی۔ پھر چائے آئی اور پھر بیرک کا سایہ بڑھ کر دوسری بیرک پر چھا گیا پھر حسب معمول نمبر دار وارڈ کے ساتھ آیا گنتی ہوئی اور ہمیں بیرک میں بند کر دیا گیا میرا کرتا جسے پہن کر میں نے عید کی نماز پڑھی تھی اور پھر گرفتاری دی تھی گذشتہ پانچ روز کی صعوبتیں جھیل کے تنگ آ چکا تھا اس عرصہ میں اس کی رنگت سفید سے مٹیالی ہو چکی تھی اور پیٹھ پر ایک بڑی سی چیر لگ گئی تھی عثمانی صاحب نے کسی سے کہا کہ انہیں ایک کرتا دیدو میں نے حیرت سے پوچھا یہاں کہاں سے کرتا پاجامہ آ گیا کہنے لگے ہمیں ہر ایک کو جیل میں آنے کے بعد دو جوڑے ملتے ہیں آپ کو بھی جیل کی طرف سے فراہم کیے جائیں گے

جب تک کے لیے آپ کسی کا پہن لیجئے" میں نے دل میں سوچا اچھا ہوا جو یہ دو جوڑے! ہر ہمیں فراہم کر دیئے گئے ورنہ شاید جیل آنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اور ہم زندگی کے اس عظیم تجربے سے شاید محروم رہتے تھوڑی

آزادی صحافت سے نفرت سپرنٹنڈنٹ جیل نے جامن کا درخت کٹوا دیا

ارشاد راؤ:

لفظوں کے ذریعے تمہارے حوصلے کی داد دینا ہے؟ بہرحال۔ مرداں چنیں کنند۔

علی احمد خاں "روداد گلستان" لکھ رہے ہیں انہیں تمہاری وساطت سے ایک خبر سنا دینا چاہتا ہوں۔ بہاولپور جیل کی بیرک نمبر ۱۱ کے صحن میں جامن کے درخت پہ اپنے ناموں کی بجائے حکیم اشرف اور ہم نے جو موٹے اور گہرے سے لفظ "آزادی صحافت" کھود دیے تھے' وہ ہماری رہائی کے تیسرے روز سپرنٹنڈنٹ صاحب نے بقول راؤ شکور مٹوا دیئے۔ اس لئے کہ وہ لفظ اس وقت تک غائب نہیں ہو سکتے تھے جب تک یہ جامن ترو تازہ رہتا۔ بہرحال ہماری خواہش تو کار مجنوں کے مترادف تھی جس کے بارے میں غالب نے لکھا تھا:

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار گلستاں پر

میدان کراچی میں گرم ہوا ہے تو اس مجنونانہ حرکت کے اعادہ کے لئے علی احمد خان کب مجھے وہاں بلواتے ہیں؟ ۔ شائد اندرون سندھ کی کسی جیل کے صحن میں کوئی شجر سایہ دار اس "تمغے" کا سزاوار ہو۔

اِک لرزشِ خفی مرے دستِ جنوں میں ہے

تمہارا
شفقت تنویر مرزا
۷۔ سانده روڈ۔ لاہور

دیر کے بعد روٹی اور دال تو بالٹی میں بھری ہوئی تھی. بڑی حیرت ہوئی اصل اسلام پر تو اس جیل میں عمل کیا جاتا ہے روٹی کپڑا اور مکان سب مہیا ہے. واہ اللہ میاں اس روٹی کپڑے اور مکان کے نعرے نے ایوب شاہی کا قلع قمع کرایا، یحییٰ کی حکومت ختم کرائی. بھٹو صاحب کو کوٹ لکھپت بھجوایا اور آئندہ جانے کس کس کے عروج و زوال کا سبب بنے. لیکن اب اس ملک کے عوام کو کیسے سمجھایا جائے کہ بھائی یہ جو آپ ان چیزوں کے لیئے بڑی سے بڑی ظالم و جابر حکومت کو دیکھتے دیکھتے مظلوم بنا دیتے ہیں یہ چیزیں صرف جیلوں میں دستیاب ہیں.

میں نے تو سوچ لیا ہے کہ اگر مجھے حکومت کو مشورہ دینے کا موقعہ ملا تو کہوں گا کہ بھائی پورے ملک کو جیل میں تبدیل کر دیجیے" تاکہ لوگوں کو دو جوڑے دو روٹی اور ایک چھت کی کم از کم ضمانت مل سکے

دوسرے دن رات کو حکیم محمد اشرف، اچھی میمن، اعجاز محمود اور ارشد خان بھی پہنچ گئے. انہیں بھی عدالت کی طرف سے روٹی کپڑے اور مکان کی ضمانت مل گئی تھی.

دوسرا دن جمعہ تھا. چھٹی کا دن اس روز مشقت نہیں آئی. بلکہ نائی آیا. جس نے لوگوں کی حجامتیں بنایئں ناخن تراشے اور مونچھ داڑھیاں برابر کیں. مجھے ذرا دقت پیش آئی اس لیئے کہ بلیڈ سے بنی ہوئی داڑھی استرے سے ذرا مشکل سے مونڈی جاتی ہے. بہرحال میں نے اسے اپنی مشقت میں شامل کر کے برداشت کر لیا اور آئندہ کیلئے فیصلہ کیا کہ استرے سے ہی داڑھی بنایئں گے تاکہ آئندہ اس صعوبت سے نہ گزرنا پڑے. واضح رہے کہ جیل میں بلیڈ رکھنے پر پابندی ہے کہ کہیں تنگ آ کر کوئی خودکشی نہ کرلے رسی رکھنے پر بھی اس لیئے پابندی ہے کہ کہیں کوئی چھت سے نہ لٹک جائے دیکھیے جان کا بھی بھرپور تحفظ فراہم کیا گیا تھا یعنی ایک مثالی فلاحی ریاست کا تصور سامنے رکھ کر جیل کی انتظامیہ تشکیل دی گئی تھی. اور اس کے طریق کار مرتب کیئے گئے تھے.

دوسرے دن طبی معائنہ اور ملاخطہ ہوا. ایک صاحب کو جن کا تعلق غالباً پیپلز پارٹی سے تھا کوڑے بھی لگائے گئے ہم جب اسپتال پہنچے تو وہ کوڑے کھانے کے بعد اپنی مردانگی کا ثبوت دینے کے لیئے اسٹریچر کے بجائے پیدل چل کر اسپتال جا رہے تھے

میں نے کہا کہ جیل میں جو تحفظات اور ضمانتیں مہیا ہیں اس کے لیئے پندرہ کوڑے معمولی قیمت ہے.

ملاخطہ میں جسم پر داغوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے یا ایسا کوئی نشان جوائنٹ ہو تاکہ شناخت کے لیئے استعمال کیا جائے داغ حسرت دل تو بے شمار تھے لیکن کوئی ایسا نشان مجھے اپنے جسم پر نہیں مل رہا تھا جس سے اسپتال کا عملہ مطمئن ہو میں گھبرا گیا کہ کہیں نشان کی غیر موجودگی میں جیل حکام میرے جسم کو داغ نہ دیں اس لیئے کہ یہ کام میرے پرکھوں نے ایک طویل مدت تک کیا ہے اپنے گھوڑوں کی شناخت کے لیئے ان کے جسم پر نمبر داغ جاتے تھے میں نے جلدی سے ایک نشان ڈھونڈ ہی ڈالا. دایئں گلے پر ایک تل، پھر ایک نشان بایئں پیر پر مل گیا. جو غالباً کسی زخم کا نشان تھا. یہ دو نشان ایسے آڑے وقت میں کام آئے تھے کہ مجھے ان سے بڑی محبت ہو گئی اور میں اب اپنے ظاہری خدوخال پر زیادہ توجہ دینے کے بجائے ان نشانات کے تحفظ کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں کہ انہیں سے میری شناخت ہو سکتی ہے جو دآگہی کی دولت اتنی آسانی سے مل جائے گی مجھے اس کا یقین نہیں آتا تھا.

اسپتال سے واپسی پر پرانے دوستوں کی شفقت میں ان کا ہاتھ بٹایا گیا. اور پھر کھانے پینے کے مراحل سے

احفاظ الرحمٰن
جنرل سکریٹری کے یو جے

گذر کر ابھی چوپال لگانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ نثار عثمانی صاحب اور حفیظ راقب صاحب کی طلبی ہوئی ان کی واپسی پر ہمیں معلوم ہوا کہ ساتھیوں کو مختلف جیلوں میں شفٹ کیا جا رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد مساوات لاہور کے ایڈیٹر بدر الدین صاحب اور پیپلز پارٹی کے ایک رکن پنجاب اسمبلی میاں احسان الحق وہاں پہنچ گئے. انہیں بھی ہماری منتقلی کی اطلاع مل گئی تھی.

تھوڑی دیر کے بعد نمبر دار صاحب ایک پرچی لیکر پہنچ گئے اسم شیخ صاحب، افضل خان، صبیح الدین غوری، حفیظ صاحب، شیر افگن، حشمت وفا کو میانوالی بھیجا جا رہا تھا یہ لوگ تیار تھے غوری بھی تیار تھے غوری ایک طویل رفاقت کے بعد مجھ سے علیحدہ ہو رہے تھے

مجھے ایک لمحہ کے لیئے تھوڑا سا تردد ہوا. ایسا دوست جس کی سگرٹیں اس کی ناراضگی کے باوجود پینے کی مجھ میں ہمت تھی یوں علیحدہ کر دیا جائے تو اپنی بے چارگی کا احساس بہر حال ہوتا ہے لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تو باقیوں میں بھی مجھے غوری ہی کی جھلک نظر آئی.

پھر فوراً ایک پرچی آئی طاہر اسدی، عاطف شیخ خالد سعید رانا وغیرہ کو لائلپور سنٹرل جیل جانا تھا یہ لوگ بھی چلے گئے ہمارے درمیان سے دو بڑے گویئے شیر افگن اور طاہر اسدی اٹھ گئے تھے یہ بڑی سزا تھی میں فیصل آباد اور میانوالی جانے والوں پر رشک کرنے لگا کہ ان لوگوں کے پاس کم از کم طاہر اسدی تو تھے جن کی آوازیں جیل کی راتوں کے سناٹوں میں زندگی کی علامت ثابت ہو سکتی تھیں. لیکن میری یہ تشویش بے بنیاد ثابت ہوئی اسلیئے کہ آنے والے تجربات نے ثابت کیا کہ جیل میں جانے کے بعد اور کوئی تبدیلی انسان میں آئے نہ آئے اس کی آواز تھوڑی سی سریلی ضرور ہو جاتی ہے. چنانچہ میں نے بھی بعد میں رفیع اور مکیش کے گانے ایسے سُر تال میں گائے کہ مرزا صاحب جو موسیقی میں بھی خاصا درک رکھتے ہیں اکثر مجھے شام کے وقت فرمائشیں کرتے تھے کہ فلاں گیت سناؤ. میری ہمت ایسی بڑھی کہ میں نے سہگل مرحوم کے گانوں کا ریاض شروع کر دیا.

بہرحال ان دوستوں کے بعد ہمارا نمبر آیا عثمانی صاحب. حفیظ راقب صاحب، احسان اللہ خان وغیرہ کو ملتان جانا تھا. جتوئی، سلیم شاہ، یونس بٹ وغیرہ کو ساہیوال جانا تھا.

اکیس افراد پر مشتمل یہ ٹولی ایک ساتھ نکلی بیرک جس میں ہم نے ڈھائی دن اور تین راتیں بڑے مزے کی گذاری تھیں وہ بھایئں بھایئں کرنے لگی مجھے مرزا صاحب کی قیادت میں اور حکیم محمد اشرف، اچھی میمن، اعجاز محمود اور ارشد خان کے ساتھ بہاولپور جانا تھا.

باہر نکل کر ڈیوڑھی پہنچے جہاں کاغذی کارروائی مکمل ہوئی" ملاشی وغیرہ لی گئی. اور باہر کھڑے ہوئے ٹرک میں بٹھا دیا گیا. میانوالی اور فیصل آباد کے ساتھیوں کا ٹرک پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا. تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ایسے سفر پر روانہ ہوئے جس میں ہمیں اپنی منزل کا پتہ تھا یہ اطمینان تھا کہ جس راستہ پر چل رہے ہیں وہی ہمیں منزل تک پہنچا سکتا ہے.

(باقی آئندہ)

پاک افغان تعلقات

سامراجی "سیاحوں" کی صحافت کے نرغے میں

جوہر میر

۲۷ راپریل کے انقلابِ افغانستان کے بعد سے اب تک پاکستان کے رجعت پسند اخبارات نے کابل سے آنے والے "سیاحوں" کے حوالے سے افغانستان کی سیاسی تبدیلیوں پر جس قسم کی تشویش کا اظہار شروع کر رکھا ہے ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انقلابِ افغانستان میں نہیں پاکستان میں آیا ہے، اور "قتلِ عام" کابل میں نہیں پاکستان میں ہو رہا ہے جس نے پاکستانی رجعت پسند دانشوروں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ طورخم کی سرحد پار کر کے آنے والے غیر ملکی سیاح پاکستان میں داخل ہونے کے ساتھ ہی نوائے وقت اور جسارت کے ہتھے کیسے چڑھ جاتے ہیں۔ ؟ وہ ان اخبارات کے پتے کابل سے لے کر روانہ ہوتے ہیں یا گھر سے چلتے ہوئے جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ سیاح کسی اور اخبار یا اخباری نمائندے کو ملے ہوں۔ ظاہر ہے کہ خبر رسانی کے اس مشکوک طریقۂ کار کا مقصد صحافت سے زیادہ سیاست ہی ہوگا اگر ایسا نہ ہوتا تو "سیاحوں" نے ان کو یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ جناب انقلاب کے بعد افغانستان میں لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ چور بازاری ناممکن بنا دی گئی ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی ہونے کے ساتھ ساتھ اشیاء کی فراوانی ہو گئی ہے، دُور دراز علاقوں کے عوام کو بھی اب آٹے دال گھی اور چینی کی صورت دیکھنے کو مل رہی ہے۔ "سیاحوں" نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ شاہی املاک بحقِ عوام ضبط ہو چکی ہیں۔ کسانوں کی رہن شدہ زمینیں واگزار ہو گئی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ داؤد شاہی جمہوریت میں جو ہزاروں بے گناہ قید خانوں میں ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ اب آزادی کی سانس لے رہے ہیں۔ یہ بھی بتایا ہوتا کہ افغان فوج کے محبِ وطن عناصر نے انقلاب برپا کرنے کے ۴۸ گھنٹوں کے اندر اندر اقتدار عوام کے نمائندوں کے حوالے کر دیا تھا اور یہ کہ افسر اور سپاہی ایک ہی جیسی سہولتوں کے مستحق قرار دے دیئے گئے ہیں۔

"سیاحوں" کی صحافت کے سیاسی پس منظر میں حکومت کے ہمنوا اور رجعت پسندوں کے ترجمان اخبارات اس توقع کا اظہار بھی کرتے رہیں کہ افغانستان کی حکومت بار بار پاک افغان متنازعہ مسئلے کا ذکر نہ چھیڑے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ افغانستان ڈیورنڈ لائین کو خطِ آسمانی سمجھ لے، اور یہ بھی کہ سرحد اور بلوچستان کے عوام کے حقوق کی بات نہ کرے کیونکہ یہ تمام معاملات پاکستان کے داخلی ہیں اس کے برعکس وہ یہ چاہتے ہیں کہ افغانستان اپنے معاملات کو پاکستان کا ذاتی معاملہ تسلیم کرے، اور جماعت اسلامی کے اخبارات کی چھیڑی ہوئی "کفر و اسلام" کی جنگ میں انقلابی حکمرانوں کو اسلام دشمن طاقت قرار دینے کا حق تفویض کرے۔ جماعتی صحافت کا کوئی بھی سنجیدہ اور محبِ وطن قاری "سیاحوں" کی خبر رسانی کی بنیاد پر کھیلے جانیوالے موجودہ کھیل کو پسند نہیں کر سکتا "صحافت" کے سیاحی تجربات کے پیچھے کار فرما سیاست سے یہ بات پوری طرح مترشح ہے کہ اگر پاکستان کی مارشل لاء انتظامیہ نے ۲۷ راپریل کے انقلابِ افغانستان کو تاریخی ممکنات کا نتیجہ سمجھتے ہوئے بروقت مناسب ردِعمل کا اظہار کیا ہوتا تو اسلام کے امریکی مفکرین کے اخبارات افغانستان کی کردار کشی میں اس قدر جوش و خروش نہ دکھائے اور اپنی غذائی ضروریات کے لئے نیوز ویک اور ٹائمز پر گزارہ کرتے رہتے۔ بدقسمتی سے نئی افغان حکومت کو تسلیم کرتے میں ہفتے بھر کے تساہل نے ہی غلط فہمیوں کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ہماری سوگوارانہ خاموشی سے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ عبدالقادر ڈگروال نے سردار داؤد کا تختہ نہ الٹا ہو حکومت پاکستان کا تختہ الٹ دیا ہو، ہم نے افغانستان کو تسلیم بھی کیا تو کچھ اس انداز سے کیا جیسے لوگ موت کو برحق کہتے ہیں ہمارے اس سوگوارانہ اندازِ تسلیم و رضا کو خود افغان حکمرانوں نے بھی محسوس کیا تھا، اور جناب نور محمد ترہ کی نے بھری مجلس میں دوستانہ شکایت بھی کی تھی۔ ہم پر انقلابِ افغانستان کا خوف اس قدر طاری تھا کہ ہم آج کے "ہمنوا" بھارت سے بھی پیچھے رہ گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تسلیم و رضا کے "مومنانہ" فعل کے ارتکاب سے پہلے ہم نے قومی اتحاد کے توپ خانے کا مُنہ کابل کی طرف پھیر دیا، مفتی محمود، طفیل اور نواب زادہ نصر اللہ سمیت اسلام کی ہر نام نہاد توپ نے افغانستان پر گولہ باری شروع کر دی۔

افغانستان کی انقلابی حکومت کے "رویے" کو اگر ہم اپنے "رویے" کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں تو ہم دیانت داری کے ساتھ یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ہماری مسلسل "مومنانہ" کوششوں کے باوجود ابھی تک افغانستان کی حکومت نے ایسا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا جس کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت یا جسے موجودہ حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش قرار دیا جا سکے۔ افغانستان کی حکومت نے اب تک زیادہ سے زیادہ جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ پختونوں اور بلوچوں کے بارے میں متنازعہ مسئلے کو پُرامن اور بات چیت کے مرحلے سے حل کرنے کی خواہشمند ہے۔ یہ ایسا موقف ہے جسے معاندانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور جسے کوئی نیا مسئلہ بھی نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ سردار داؤد نے

بھی پیش کیا تھا اور بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ان کی اس خواہش کو حکومتِ پاکستان نے پذیرائی بھی بخشی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مسئلہ بطور مسئلہ پہلے سے موجود تھا اور جس پر مفاہمت کی ابتدا بھی ہو چکی ہے اسے اب کیونکہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے یا چھیڑ چھاڑ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ "سیاحوں" کی زبان سے ہم نے افغانستان کے خلاف غیر سرکاری طرز پر جس جنگ کا میدان گرم کر رکھا ہے وہ کسی دانشمندانہ سوچ کا حامل نہیں ہے اپنے معروضی حالات کے حوالے سے بھی ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ افغانستان پر سنگ باری کر سکیں۔ چلتے چلتے ہمیں اس غلط فہمی میں بھی نہیں رہنا چاہیئے کہ ہم غیر سرکاری جنگ کو گرم اور سرکاری جنگ میں بدل کر کوئی مادی یا پھر سیاسی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ صدیوں کے کرب اور سالہا سال کی ریاضتوں کے بعد جنم لینے والے افغانستان کے موجودہ انقلاب کے بارے میں ہمیں زیادہ سے زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے، ہم مثال دے کر سمجھا سکتے ہیں وہ بھی اس لئے کہ جوشِ جنوں میں جب عقل ماری جاتی ہے تو کچھ لوگ گھر پھونک کر تماشہ دیکھنے کی جھک بھی مار لیا کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے کیوبا کی بڑی کھلی اور واضح مثال موجود ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سامراجی قوت کے عین پڑوس میں کیوبا کا وجود اس بات کا شاہد ہے کہ فوجی طاقت یا سیاسی اور اقتصادی اجارہ داریوں کے باوجود امریکہ کیوبا کو ختم کرنے سے عاجز ہے وہ اپنی سی بہت سی کوششیں کر کے دیکھ چکا ہے۔ ویت نام اور کمبوڈیا کی مثالیں بھی دور کی نہیں ہیں کھلی جارحیت کے بعد بھی امریکہ اپنے مقصد پورے نہیں کر سکا لہذا اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ افغانستان کا ہوّا دکھا کر پاکستان کو امریکی مقاصد کا آلہ کار بنانے اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے تو یہ انتہائی بیہودہ خام خیالی سے زیادہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم افغانستان کے خلاف امریکی جنگ میں آلہ کار بنیں کیوں؟ جنگی معاہدوں کی دوستی اور پاکستان کی سلامتی کو امریکی خارجہ پالیسی کا اٹوٹ حصہ بتانے والے امریکہ نے پاکستان پر ٹوٹتی ہوئی جنگوں میں خود کیا کردار ادا کیا تھا؟ کیا اس نے پاکستان کے خلاف کسی جارحیت کو امریکہ کے خلاف جارحیت سمجھا تھا؟ یقیناً کبھی نہیں، پھر دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ افغانستان کے انقلاب کو ہم پاکستان کا مسئلہ کیوں سمجھیں؟ ایک طرف تو صبح سے شام تک ہم نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک مسلمانوں کی وحدت کے نعرے بلند کرتے نہیں تھکتے دوسری طرف ہم افغانستان کو اسلام کی فہرست ہی سے خارج کر دیں ایک طرف تو ہم خود بھی اور ہمارے نئے بھائی اٹل بہاری واجپائی افغانستان کو از راہ مرحمت ڈیورنڈ لائن کے احترام کے مشورے دیں دوسری طرف ہم اسی ڈیورنڈ لائن کے اس پار بسنے والوں کو اسلام کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف کٹ مرنے پر اکسائیں؟ اگر رجعت پسند اخبارات پاکستان کی حکومت کو افغانستان کے خلاف امریکی مقاصد کی جنگ میں دھکیلنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش نہیں کر رہے ہیں تو پھر اس کھیل کا اصل مقصد کیا ہے اور حکومت نے اس خطرہ ناک اور گھناؤنے کھیل سے چشم پوشی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟

پاکستان اپنے داخلی مسائل اور لامتناہی بحران کی نسبت سے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ عبوری حکومت کو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے اب تک جتنی کروٹیں بدلنی پڑی ہیں وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ سابق حکومت کا تختہ الٹنے کے کام کو جتنا آسان سمجھا گیا تھا وہ اتنا آسان ثابت نہ ہو سکا، مسائل کے حل اور سابق حکومت کی عوامی ساکھ کے بارے میں جو اندازے قائم کئے گئے تھے وہ درست ثابت نہ ہو سکے اسی طرح جن طاقتوں پر تکیہ کر کے تبدیلی عمل میں لائی گئی تھی وہ کاغذی دیو ثابت ہوئیں، وہ تبدیلی کے بعد کی تبدیلیوں کے تسلسل کو اپنا تابع نہیں بنا سکیں اسلام کے نام ہی پر حکومت کی تمام تر دلجوئی اور حوصلہ افزائیوں کے باوجود قومی اتحاد کو قومی انتشار بننے سے نہ روکا جا سکا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار کی تبدیلی کے باوجود زیر دستوں کی مزاحمت ابھی تک جاری ہے۔ ہم اس مزاحمت کو خاموش مزاحمت کا نام دے سکتے ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان کے عوام کو اپنے مقدر کے فیصلوں پر اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عدالتوں کے باہر لوگ کیا کہتے اور کیا چاہتے ہیں۔ جانتے سبھی ہیں۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جو پانسہ پلٹا ہوا نظر آیا تھا درحقیقت وہ ابھی تک جوں کا توں ہے۔ اہم اور غیر اہم کے درمیان مزاحمت اسی شدت سے جاری ہے بھٹو ایوانِ وزیر اعظم سے پھانسی کی کوٹھڑی تک پہنچ چکا ہے مگر یوں لگتا ہے وہ اب بھی پاکستان کے عوام اور حکومت کا سب سے اہم مسئلہ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو خاموش مزاحمت کا دم ٹوٹ چکا ہوتا جیل بھرے نہ ہوتے، نااہلی کے ٹریبونل اس قدر مصروف نہ ہوتے کیونکہ پیپلز پارٹی کے پاس کم از کم چوہدری ظہور الٰہی سے تو بہتر وزرات تھے۔ مختصر یہ کہ ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ افغانستان کے اسلام پسند افغانستان کی انقلابی حکومت کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں؟ ہم کس منہ سے انقلابی حکومت کے نمائندوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے سکتے ہیں جب کہ خود ہمارے ہاں نظامِ مصطفیٰ کے علمبردار اپنے تمام دعدوں سے منحرف ہو کر حکومت سے وفاداری ہی کو نظامِ مصطفیٰ کا مقصد و منشا قرار دے چکے ہیں؟ اسلام کے نام پر ہماری گلکاریاں آخر کس سے پوشیدہ ہیں۔ ہم نے مودودی کو مفکرِ اسلام کی سرکاری سند دے کر کیا بانیٔ اسلام کا درجہ نہیں دے دیا؟ کیا ہم نے تفہیم القرآن کو قرآن مجید سے بالاتر نہیں بنا رکھا؟ ہم تو نظامِ مصطفیٰ کو بھی نظامِ مودودی سمجھتے اور سمجھاتے پر تلے ہوئے ہیں پھر ہم کس حیثیت سے افغانستان میں کسی کفر و اسلام کی جنگ کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ چلئے جناب افغانستان میں کفر و اسلام کی جنگ نہ سہی، یہ تو ہے کہ وہاں "عوام" حکومت کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں بات اگر اس پیرائے میں کی جائے تب بھی ہم اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہیں پاتے کہ ٹنگالیں۔ خود ہمارے ہاں بلوچستان اور بنگلہ دیش کی مثالیں موجود ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اسلامی فراخدلی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا ہو گا کہ بلوچستان اور بنگلہ دیش کے عوام کی فوج کے خلاف مزاحمت جائز اور برحق تھی۔ یہ طے کرنا بہر حال جماعت اسلامی کے اخبارات کا منصب نہیں کہ افغانستان میں جو لوگ مزاحمت کر رہے ہیں ان کی مزاحمت خود ان کی مزاحمت بھی ہے اور یہ کہ وہ مزاحمت سامراجی طاقتوں کے اشارے پر نہیں یا یہ کہ وہ انقلابی مزاحمت ہے۔ ہمارے پاس اس مزاحمت کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ جس مزاحمت کو جماعت اسلامی کے اخبارات بڑھا چڑھا کر اسلامی مزاحمت بنا کر پیش کریں وہ سامراجی مزاحمت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتی اور سامراجی مزاحمت کی شکست اور ناکامیوں پر تاریخ ایک بار نہیں سینکڑوں بار مہر ثبت کر چکی ہے۔ اگر اس کے باوجود بھی کوئی عقل و دانش سے کام نہ لے تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ بسم اللہ کیجیئے، آگے آیئے، او افغانستان میں اسلام نافذ کر لیجیئے، تاہم پہلی ضرورت یہی ہے کہ اول خویش بعد درویش کے مصداق ابتدا گھر ہی سے کیجیئے بشرطیکہ عبوری حکومت ابھی تک اپنے آپ کو جماعت اسلامی اور دیگر رجعت پسندوں کے ساتھ سختی کرنے کی متحمل بھی ہو اور یہ تہمت اپنے سر لینے کے لئے تیار بھی ہو کہ سیاحوں کی صحافت اُس سے وہ متفق ہے۔

حکمرانوں کی آنکھوں کانوں

اور عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں

ڈاکٹر مبشر حسن سے غیر رسمی گفتگو

عبدالمجیب خاں

عوام کو روٹی اور روزگار مہیا کئے بغیر ملک کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا

مجیب :۔ برّصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ وہاں وہ امن و سکون کے ساتھ اپنی زندگی گذار سکیں اور ان کی آنے والی نسلیں بھی آئے دن کے ہندو مسلم فسادات سے نجات حاصل کر لیں لیکن قیام پاکستان کی تیس سالہ تاریخ میں عوام کو انتہائی تکلیف دہ بحرانوں کا سامنا رہا۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہات ہیں اور وہ کیا اسباب ہیں جس کی وجہ سے عوام مسلسل بے چینی اور ذہنی پریشان حالی کا سامنا کر رہے ہیں؟

مبشّر حسن : یہ درست ہے کہ پاکستان مسلسل سیاسی بحرانوں کا شکار رہا ہے۔ پاکستان بننے سے قبل تحریک پاکستان کے مخالفوں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ ان میں سے بعض اس کے درست ہونے کے متعلق شبہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہیں کہیں پاکستان کے متعلق مایوسی اور افسوس کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ان کو مستقبل بھی مخدوش نظر آتا ہے۔ اور وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اب کیا ہوگا؟

دراصل بنیادی بات یہ ہے کہ تاریخ کی بڑی بڑی تحریکیں اور واقعات افراد کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہوتے یہ صحیح ہے کہ افراد اور ان کے ساتھی گروہ، تحریکوں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن افراد اور ان کے ساتھی گروہوں یا جماعتوں کی قوتوں کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان سے قبل مسلم لیگ یا کسی پارٹی کی لیڈر شپ کے ہاتھ میں یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان بننے کو روک سکے۔ البتہ پاکستان بنانے کے لئے محبِ وطن، دیانتدار، قابل اور زیرک لیڈر کی ضرورت تھی اور یہ رہنمائی قائداعظم نے سر انجام دی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کا بننا ایک تاریخی عمل تھا اور اس تاریخی عمل کی رہنمائی قائداعظم نے کی تھی۔

پاکستان کے وجود میں آنے کا تاریخی عمل اس لئے اٹل ہو گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سینکڑوں سالہ تضاد لاینحل بن گیا تھا۔ یہ تضاد ہمہ گیر تھا، یعنی اس کے معاشی، معاشرتی، ثقافتی سیاسی اور نظریاتی پہلو تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پُرامن مفاہمت کی راہیں مفقود ہو چکی تھیں۔ اسی لئے مسلمانوں نے الگ ہونے پر اصرار کیا۔ تحریکیں چلائیں۔ قربانیاں دیں اور کامیابی حاصل کی۔ وہ وجوہات کیا تھیں کہ جن کی وجہ سے یہ تضاد لاینحل بن گیا۔ وہ بھی تاریخی عمل کا حصّہ ہیں۔ اور اس کے لئے بھی افراد کو ضرورت سے زیادہ کریڈٹ دینا یا موردِ الزام ٹھہرانا درست نہ ہوگا۔ ۱۹۴۵ء کے بعد سے اب تک ۱۰۰ سے زیادہ نئی قومی سلطنتیں وجود میں آ چکی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کا الگ الگ قومی ریاستوں کی حیثیت سے وجود میں آنا ایک بڑے عمل کا حصّہ تھا۔ اور اس عمل کی بنیادی سیاسی حقیقتیں سامراجی طاقت کے زوال اور غلام قوموں کی آزادی میں مضمر ہیں۔

اس نظریے سے اگر دیکھا جائے تو پاکستان بننے کے بعد کے عمل کو پاکستان کے وجود میں آنے کے عمل سے الگ تصور کرنا چاہیئے۔ کسی نئے قومی پودے اور ریاست کی نشو و نما کو ایک محدود حد تک ماضی سے منسلک رکھنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان پوری طرح آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں آج تک نہیں آیا۔

آزادی سے قبل بھی پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے علاقوں پر سامراجی تسلط تھا اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی پاکستان پر سامراجی تسلط قائم رہا۔ مطلب یہ ہے پاکستان بننے کے بعد اس ملک میں جو بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں باقی رہیں یا جن خرابیوں اور کمزوریوں نے فروغ پایا اس کی بڑی وجہ پاکستان پر سامراجی تسلط تھا اور ہے۔ اس کی وجہ پاکستان کا وجود میں آنا نہیں تھا۔ وجود میں آنے کے بعد پاکستان کو صرف روزمرہ زندگی میں ہندو مسلم تضاد سے نجات ملی تھی، یعنی کہ ہندو، بنیا، ساہوکار، افسر، زمیندار، مالک زمین، کارخانے دار سے داخلی طور پر نجات حاصل ہوئی تھی۔ گو ریاستی سطح پر اس پرانے تضاد میں پاکستان اور ہندوستان کے مابین ایک قومی تضاد کی صورت اختیار کر لی جو آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ ہندو بنیا، ساہوکار، افسر، مالک زمین و مکان اور کارخانے دار سے تو پاکستان میں رہنے والے مسلمان غریبوں، محنت کشوں، نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگوں کو نجات ملی لیکن ہوا یہ کہ ہندو اور سکھ استحصالیوں کی جگہ مسلمان استحصالیوں نے لے لی۔ اور ان پر سامراج کی چھتری کا گھنا دنا سایہ اسی طرح قائم رہا۔

اگر اس پس منظر میں پاکستان کے وجود میں آنے کو دیکھا جائے، تو عوام کی مشکلات کا بہتر اندازہ کرنے کے لئے ہمارے پاس صحیح نشاندہی کی شمعیں ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ جس قسم کی تکالیف، مصیبتیں، انتشار جبر و ظلم کا شکار پاکستان کی آبادی کی اکثریت ہے۔ اسی طرح ان مظالم کا شکار بھارت اور بنگلہ دیش کی آبادی بھی ہے۔ اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ ایک الگ ملک کی حیثیت سے پاکستان کے وجود میں آنے سے مسائل پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان مسائل کی بنیادیں کہیں اور ہیں، البتہ پاکستان کے وجود میں آنے سے بعض بنیادی باتوں میں پاکستانیوں کو ہندو قوم کے نظریاتی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی جبر و ظلم سے نجات مل گئی۔ مطلب یہ ہے کہ پاکستان کا ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آنا امن و سکون کے ساتھ اپنی زندگی گذار سکنے کی منزل کے سفر میں ایک پہلا قدم تھا اور یہ قدم ضروری تھا۔ جب تک ہر لحاظ سے نجات حاصل نہ کر لی جائے پاکستان کے عوام کی اکثریت امن و سکون کی زندگی کیسے بسر کر سکتی ہے۔ اس لئے پاکستانی قوم کو منزل مقصود تک پہنچنے کی جدوجہد کا پہلا حصہ ہندوؤں اور سکھوں کے غلبے سے نجات حاصل کرنا تھا اور دوسرا حصہ سامراجیوں اور مقامی استحصالیوں کے غلبے سے نجات حاصل کرنا ہے

پاکستانیوں کی اکثریت کے لئے مکمل نجات حاصل کرنے کا سفر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا ہے۔ یہ مفروضہ غلط تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد سرزمین پاکستان پر سامراجیوں اور استحصالیوں کا غلبہ ہٹائے بغیر ہی پاکستان میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ اگر اس پس منظر کو سامنے رکھ لیا جائے تو یہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ پاکستان میں سیاسی بحرانوں کی حقیقت کیا ہے۔؟

آپ کا سوال یہ ہے کہ تیس سالہ تاریخ میں عوام کو یکے بعد دیگرے انتہائی تکلیف دہ بحرانوں سے کیوں گذرنا پڑا۔

جواب بہت آسان ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کو ورثے میں جو معاشی، سیاسی، ثقافتی اور نظریاتی ڈھانچہ ملا وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک ٹولہ جب اس کو چلانے میں ناکام ہو جاتا تو دوسرا ٹولہ سامنے آتا تھا۔ طرح طرح سے اس کی مرمت کرتا تھا۔ اس میں نئے پرزے لگاتا تھا اور پھر اسے چلانے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اور جب یہ ٹولہ بھی ناکام ہو جاتا تھا تو پھر ایک نیا ٹولہ اس کی جگہ لے لیتا۔ ایک ٹولے کے ہٹنے اور دوسرے کے آنے کا نام بحران ہے۔ پاکستان میں جتنے بھی بحران آئے وہ ایک حکمران ٹولے کی حکمرانی اور کسی دوسرے حکمران ٹولے کی جگہ لینے کی کامیاب یا ناکام کوشش سے آئے۔ دراصل پاکستان میں بار بار ان بحرانوں کا آنا اس معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام کے نہ چل سکنے کی دلیل ہے۔ اور یہ حقیقت سب پر عیاں ہیں۔ ماسوائے ان کے جو اس بوسیدہ نظام کو چلانے میں مصروف ہیں یا چلانے والوں کی جگہ چھیننے میں مصروف ہیں یا جگہ چھین کر اپنے آپ کو مستحکم کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں حکمران ٹولوں کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں نہ ان کو موجودہ صورت حال کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں آئندہ کی راہ نظر آتی ہے ان کو ان کے مفادات نے گمراہ کر رکھا ہے۔ ٹھوس حقائق کی شکل میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ پاکستان کے سامراج نواز جاگیردار اور افسر شاہی نے گذشتہ تیس سال میں حکمران کی غرض سے جتنے بھی جوڑ توڑ کئے ہیں روپ اور بہروپ بھرے ہیں اور نت نئے ٹولے تشکیل دیئے ہیں وہ سب اپنے مشن میں فیل ہو گئے ہیں یعنی کہ وہ پاکستان میں خوشحالی کا دور دورہ لانے اور وطن عزیز کو مضبوط بنانے میں ناکام رہے چنانچہ پاکستان میں حکمران طبقوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عہدِ حاضر میں پیداوار کرنے کے جو طریقے اور صلاحیتیں موجود ہیں، یہ ان سے استفادہ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کارخانے، اسکول، یونیورسٹیاں، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ٹریکٹر، بلڈوزر، ریلوے کیمیاوی کھاد، جراثیم کش ادویات، بلڈ بینک وغیرہ وغیرہ دقیانوسی نظام ملکیت اور اس سے منسلک دھونس، دھاندلی، جبر و ظلم، اغوا، جسمانی سزائیں اور ان کے سہارے کے لئے قرونِ وسطیٰ کے ناقابل عمل نظریاتی ڈھانچوں کے تحت نہیں چلائی جا سکتیں۔ نئے نظام کو پرانے انتظامات کے ذریعے چلانا ناممکن ہے اور اگر ان کو چلانے کی کوششیں کی جائیں تو اس کے لئے ظلم و جبر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ با خوشی خوشی سے پیداوار نہیں کیا جاتا، اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ ظلم و جبر جاری و ساری رہتا ہے۔ جہالت و گمراہی کے نظریات کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ ترقی ہونی ناممکن ہوتی ہے۔ ملک کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس کے توڑنے میں دشمنوں کو کامیابیاں ہوئی ہیں۔

مجیب: ۱۹۷۱ء کے جس عظیم المیہ سے پاکستان کو گذرنا پڑا تھا اس میں آپ کے نزدیک کیا سیاسی قوتوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا یا نوکر شاہی اور غیر سیاسی قوتوں کو ۔؟

مبشر حسن: ۱۹۷۱ء کے عظیم المیہ کی ذمہ داری ہمارے غیر منصفانہ نظام پر عائد ہوتی ہے۔ کسی قوم کا ایک جزو ایک حد تک ہی بے انصافی، ناہمواری برداشت کر سکتا ہے۔ ہم نے مشرقی پاکستان سے بے شمار ظلم روا رکھے۔ ۱۹۴۸ء میں مشرقی بنگال کے صوبے کے منتخب ممبروں نے اسمبلیوں میں شکایت کرنی شروع کی کہ ان کے صوبے کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس شکایت اور شکایت کی وجوہات میں اگلے بائیس برس تک اضافہ ہی ہوتا رہا۔ آخر وہ کب تک ساتھ دیتے؟ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان میں کپڑے کی بارہ فیکٹریاں تھیں اور مغربی پاکستان کے

نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگانے والوں نے عوام کی خوشحالی اور ترقی کے لئے کوئی پروگرام پیش نہیں کیا

صوبوں میں تین۔ زمانہ قدیم سے مشرقی پاکستان ٹیکسٹائل کی صنعت میں مشہور تھا۔

۱۹۷۰ء میں مغربی پاکستان میں ساڑھے تین سو فیکٹریاں تھیں اور مشرقی پاکستان میں صرف ۲۵، مغربی پاکستان کی تیز رفتار گاڑی بارہ گھنٹے میں ساڑھے چار سو میل سفر کرتی تھی اور مشرقی پاکستان میں صرف ۱۰۰ میل ایک طویل عرصہ تک مشرقی پاکستان کے لوگوں کو فوج میں داخل ہونے کا اہل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا مشرقی پاکستان کی غربت عالمی پیمانے پر بدترین درجے پر تھی مغربی پاکستان میں ایسا نہ تھا اور اس طرح کہ ہزاروں حقائق جمع کئے جا سکتے ہیں ۱۹۷۱ء کا المیہ اس لئے ہوا کہ پچاس فیصد سے زائد آبادی کی شکایات کا مداوا نہ ہو سکا۔ ان واقعات کو کیسے موردِ الزام ٹھہرایا جائے اس کا جواب ظاہر ہے کہ اس غیر منصفانہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام اور اس نظام کے چلانے والوں کو جن کے پاس حکومت کی طاقت رہی

مجیب :- ۱۹۷۱ء میں پاکستان ٹوٹنے کے بعد بعض حلقے مولانا ابوالکلام آزاد کی پیشگوئی کو درست محسوس کر رہے ہیں اور حالیہ چند ماہ میں جو غیر یقینی صورتحال محسوس کی جا رہی ہے اس سے بھی ان خدشات کو مزید تقویت مل رہی ہے اس سلسلے میں آپکا کیا خیال ہے؟

مبشر حسن :- جو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کی پیشگوئی کو درست محسوس کر رہے ہیں یعنی کہ جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ مولانا آزاد نے صحیح کہا تھا کہ پاکستان ایک کامیاب مملکت نہیں بن سکے گا۔ ان کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ کچھ اور انتظار کریں تو انہیں پتہ چلے گا کہ غیر منصفانہ اور ظلم و جبر سے بھرپور کوئی ریاست بشمول مولانا آزاد کی بھارت کے، قائم نہیں رہ سکتی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے کا تعلق اور آئندہ سالوں میں بھارت میں علاقائی خود مختاری کی تحریکوں کے فروغ کا تعلق ہے مولانا مرحوم کے نجوم پن سے نہیں ہے بلکہ مروجہ معاشی اور معاشرتی نظاموں سے ہے یہ درست ہے کہ خطرہ لاحق ہے لیکن اس خطرے کا بھارت سے ۱۹۴۷ء میں جدا ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ خطرہ تاریخی عمل کا حصہ ہے لیکن سو سال اکٹھے رہنے کے بعد اسکاٹ لینڈ اور ویلز انگلینڈ سے آزادی مانگ رہے ہیں دو سو سال ساتھ رہنے کے بعد فرانسیسی بولنے والا کیوبک کا صوبہ کینیڈا سے آزادی مانگ رہا ہے کشمیر میں شیخ عبداللہ بنگال میں جے لی باسو پنجاب میں بادل اور اسی طرح بھارت کے مختلف صوبوں کے حکمران مرکز سے مزید اختیارات کا مطالبہ کر رہے ہیں

یہ سب باتیں ابوالکلام آزاد کی سمجھ سے بالا تھیں اگر ان میں سیاسی سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ پاکستان کے قیام کی مخالفت نہ کرتے بلکہ پاکستان کی حمایت کرتے اور قیام کے بعد اس ملک میں ایک منصفانہ اور عادلانہ نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کرتے۔ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں جو لوگ مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو اپنے علّلے تللے ختم ہوتے نظر آ رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے گذشتہ تیس سال کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیا۔ اب انہیں اپنے لوٹ کھسوٹ کو جاری ساری رکھنا مشکل نظر آ رہا ہے تو انہیں طرح طرح کے خدشات پریشان کر رہے ہیں۔ یہ بے غیرت اور وطن دشمن لوگ ہیں ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں کہ جو موجودہ صورتحال سے اسلئے خائف ہیں کہ اگر وطن عزیز میں عادلانہ اور منصفانہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام کی ابتدا نہ کی گئی تو ملک کی تقاروسالمیت کو سخت دھچکا لگے گا اور مسلمانانِ پاکستان کی جدوجہد بیسیوں سال پیچھے چلی جائے گی۔

مجیب :- پی این اے کی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیا واقعی یہ "نظام مصطفیٰ" کی تحریک تھی۔

مبشر حسن :- قوم آج جس خطرناک موڑ پر کھڑی ہے اس کے اس موڑ تک سفر کے سلسلے میں میں کسی نعرے کو موردِ الزام نہیں ٹھہراؤں گا۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نعرہ کیا استعمال کیا جائے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ نعرہ کی پشت پر کس قسم کے معاشی سیاسی اور معاشرتی نظام کو آگے بڑھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں موجودہ معاشی سیاسی اور معاشرتی نظام کو قائم رکھنے کے لئے دلکش سے دلکش اور انتہاپسند سے انتہاپسند نعرے فیل ہو جائیں گے۔ البتہ موجودہ نظام میں تبدیلی لانے کے لئے اور معاشی اور معاشرتی نظام کو قائم رکھنے کے لئے جو نعرہ بھی عوام میں مقبول ہو وہ استعمال کیا جا سکتا ہے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگانے والوں نے کوئی ایسا عملی پروگرام پیش نہیں کیا کہ جس سے پاکستان میں خوشحالی اور مضبوطی لانے والی تبدیلیاں کی جا سکیں۔

مجیب :- نفسیاتی طور پر جب عوام کو ذہنی سکون اور پرامن ماحول میسر ہو گا تو ان کے سیاسی رجحانات کیا ہوں گے؟

مبشر حسن :- اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے کیونکہ ذہنی سکون اور نفسیاتی معاملہ عوام کے سیاسی رجحانات میں فیصلہ کن نہیں ہوتے آپ آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ امریکہ میں ذہنی سکون نصیب نہیں ہوتا۔ آبادی کا بڑا حصہ ذہنی ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ ذہنی سکون نہیں ہے بلکہ روٹی روزگار مہنگائی، معاشرتی ظلم اور سامراج اور توسیع پسندوں کی سازشیں ہیں بیروزگاری مہنگائی اور بنیادی ضرورتوں کا فقدان لوگوں کو جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے انہیں سکھاتا ہے کہ معاشرہ کا انتظام درست نہیں ہے۔ یعنی کہ معاشرے کا انتظام کرنے والے نالائق اور نااہل ہیں، غربت ناداری اور بے روزگاری انہیں حکمرانوں کے خلاف کر دیتی ہے جب پرجا ناخوش ہو تو راجہ آرام سے نہیں سو سکتا۔ لہٰذا ایسے دنوں میں حکومت چلانی مشکل ہو جاتی ہے نئے حکمرانوں کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور یہی حالات سامراجیوں اور توسیع پسندوں کی سازشوں کی کامیابی کے لئے سازگار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حالات میں ملک کی تقاروسالمیت کو شدید خطرہ لاحق رہتا ہے۔

مسز اندرا گاندھی کا انٹرویو

***

ترجمہ: فاروق طارق

شاہ کمیشن میرے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکا

بھارت میں امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے •

کے نتائج تسلیم نہ کرتی' اندرا

[اندرا گاندھی سے یہ انٹرویو بھارت میں جرمنی کے ہفت روزہ "در سپیگل" کے نمائندے مسٹر ایس پی سنہا نے لیا ہے۔ مسٹر سنہا کو اندرا گاندھی کے دورِ اقتدار میں ایمرجنسی کے دوران ۱۹۷۵ء میں ملک بدر ہو کر نیپال جانا پڑا تھا]

سنہا:۔ بھارت کے عام انتخابات ۱۹۷۷ء کے بعد اقتدار سے ہٹ جانے پر آپ کی سیاسی حیثیت کو سخت دھچکا پہنچا اور آپ غیر مقبول ہوتی گئیں لیکن حال ہی میں آپ دوبارہ قوت پکڑ رہی ہیں۔ اس کے لئے آپ کس قسم کی حکمت عملی سے کام لے رہی ہیں؟

اندرا گاندھی:۔ میں اسے درست نہیں مانتی کہ میرا سیاسی کردار ختم ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی اپنی سیاسی قوت نہیں کھوئی۔ اسی مضبوط سیاسی کردار کی بنا پر شاہ کمیشن نو ماہ بعد بھی اب تک، میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکا ہے۔ میرے مخالفین جو کچھ کر رہے ہیں وہ غلط ہے ان کا مجھ پر الزامات عائد کرنا اور حکومت میں شامل افراد کا میری بدعنوانیاں ڈھونڈنا، ایک عالمی ردِ عمل ہے۔ ہر جگہ

جنتا پارٹی کھچڑی بھی نہیں کیونکہ اس کا ذائقہ عمدہ ہوتا ہے

ایسا ہی ہوتا ہے۔

سنہا :۔ ہر جگہ کس طرح؟

اندرا گاندھی :۔ حکومت کے پاس سارے اختیارات ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے افراد متعین کر سکتی اور پھر ان کے ذریعے دوسروں کی برائیاں ڈھونڈ سکتی ہے۔

سنہا :۔ لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے دورِ اقتدار کی ایمرجنسی کے دوران لوگوں کی ایک خاصی تعداد آپ سے مطمئن نہ تھی۔

اندرا گاندھی :۔ میرے خلاف رائے عامہ کو ایک منظم پروپیگنڈے کے ذریعے غلط راہ پر ڈالا گیا تھا۔ اس پروپیگنڈے میں بعض ملکی اخبارات کے علاوہ غیر ملکی پریس کا بھی بڑا ہاتھ تھا اور وہ سب کچھ جو ایمرجنسی کے بارے میں کہا گیا۔ درست نہ تھا۔ انتخابات سے صرف ایک ہفتہ بعد ہی لوگ میرے پاس آنے شروع ہو گئے تھے۔

سنہا :۔ کیا آپ کے پاس ایمرجنسی سے متاثر ہونے والے لوگ آئے تھے؟

اندرا گاندھی :۔ یہ لوگ پروپیگنڈے کے زیرِ اثر میری مخالفت کرنے پر مجبل مند تھے۔ مثلاً پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ میری حکومت میں ہر شخص کو خاندانی منصوبہ بندی یا نس بندی کے لئے مجبور کیا گیا اور سکول کے بچوں کو نس بندی کے انجکشن لگائے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب پٹنہ میں ملیریا کی وبا پھیلی تو اس غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں نے انجکشن لگوانے سے انکار کر دیا۔ موجودہ حکومت ابھی تک اس پروپیگنڈے کو ہمارے خلاف استعمال کر رہی ہے۔

سنہا :۔ آپ اقتدار کا تجربہ رکھتی ہیں۔ کیا اس بنا پر آپ کہہ سکتی ہیں کہ آپ کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کا کوئی امکان ہے؟

اندرا گاندھی :۔ آپ نے یہ بات کیوں کہی؟ میں تو صرف خالصتہً سیاسی عمل اور نظریے پر یقین رکھتی ہوں تام نہاد اقتدار حاصل کرنا میرے لئے مسئلہ نہیں ہے۔

سنہا :۔ کیوں نہیں ہے؟

اندرا گاندھی :۔ اگر آپ کی مراد میرے ملک کی سربراہ ہونے سے ہے تو مجھے معلوم نہیں کہ میں یہ چاہتی بھی ہوں یا نہیں۔ لیکن اگر آپ کی مراد میری سیاسی واپسی سے ہے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ میں کبھی سیاست سے دور رہی نہیں رہی میں سیاست سے الگ نہیں رہ سکتی ہر چند کہ میرے دل میں چین و سکون سے زندگی بسر کرنے کی خواہش کیوں نہ ہو کیوں کہ غریبوں کی خدمت میری زندگی کا مقصد ہے۔

سنہا :۔ اس سال کے شروع میں آپ نے ایک نئی سیاسی پارٹی "انڈین کانگریس" بنائی۔ فروری میں اس پارٹی نے شاندار نتائج دکھائے اور شمالی ہند میں الیکشن بھی جیتے۔ اس کے باوجود جنتا پارٹی کے لیڈروں کا دعویٰ ہے کہ آپ دوبارہ برسرِ اقتدار نہیں آسکتیں۔

اندرا گاندھی : جنتا پارٹی کے لیڈروں نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ درست بھی نکلا ہے؟

سنہا :۔ جنتا پارٹی اندرونی طور پر مضبوط ہونے کی جدوجہد

گمراہ کن پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں نے ملیریا کے انجکشن لگوانے سے انکار کر دیا

کر رہی ہے اور آپ نے اسے کھچڑی سے تشبیہہ دی ہے اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

اندرا گاندھی :۔ ہاں میں نے اسے کھچڑی کہا ہے لیکن ہمارے سیاسی مخالف اسے کھچڑی کہنے کو بھی تیار نہیں ہیں کہ کھچڑی کا ذائقہ بہت اچھا ہوتا ہے اور یہ اچھی چیزوں سے بنتی ہے۔

سنہا :۔ آپ جنتا پارٹی کے اقتدار میں آنے پر اس کی کامیابی کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

اندرا گاندھی :۔ کیا کوئی اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں؛ ملک انارکی کی حالت میں ہے۔ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے بیروزگاری بڑھتی جا رہی ہے۔ پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر جگہ علاقائی سیاسی گروپ کامیاب ہو رہے ہیں۔

سنہا :۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۳۱ سال گذرنے کے بعد بھی بھارت کے لوگوں کی حالت سُدھری نہیں ہے۔ آپ نے ایمرجنسی کے دوران ملک کی ڈسپلن اور استحکام کی تعریف کی تھی۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ بھارت کو کسی ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے؟

اندرا گاندھی : میں آپ کے سوال کرنے کے انداز کو اچھا نہیں سمجھتی۔ اگرچہ بھارت اس وقت بری حالت میں ہے لیکن تقسیم کے وقت کی حالت سے بہت بہتر ہے۔ جہاں تک غربت کی بات ہے تو یہ امریکہ میں بھی ہے۔ برطانوی دور میں لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے اور نہ قحط کی صورت رہتی ہے۔ البتہ بھارت میں امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے لیکن یہ صورت اس طرح ہے کہ عالمی طور پر امیر ملک امیر تر اور غریب ملک غریب تر ہو رہے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بھارت کے لئے جمہوریت ہی اچھے نتائج برآمد کر سکتی ہے کیوں کہ ہمارے لوگ عموماً شخصیت پسند ہیں اور ہمیں ڈسپلن کی ضرورت ہے لیکن زبردستی کی نہیں بلکہ اپنی مرضی سے۔

سنہا :۔ آپ نے ہنگامی حالات کیوں نافذ کئے تھے؟

اندرا گاندھی :۔ یہ ایک لمبی تاریخ ہے۔ دھمکی سے انارکی کو ختم کرنا ضروری تھا۔

سنہا :۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کی وجہ سے آپ کا سیاسی کردار مشکوک ہو گیا لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا اقتدار ختم کرنے میں آپ کی اپنی ذات کا دخل تھا۔

اندرا گاندھی :۔ یہ بات صرف ہمارے ذاتی مخالف ہی کہہ سکتے ہیں۔ عدالت کے فیصلے کو اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کہ بحران حالت میں دیا گیا جب انارکی اور غنڈہ گردی عروج پر تھی۔

سنہا :۔ کیا ہنگامی حالات کا نفاذ آپ کو اقتدار میں رکھنے کا ذریعہ نہیں تھے۔؟

اندرا گاندھی :۔ اگر میں برسرِ اقتدار میں رہنا چاہتی تو انتخابات نہ کراتی اور پھر اس کے نتائج کو تسلیم نہ کرتی۔

سنہا :۔ کیا ہنگامی حالات کے دوران آپ نے اپنے بیٹے کے سیاسی کردار کو مضبوط کرنے اور اسے اپنا جانشین بنانے میں مدد نہیں دی؟

اندرا گاندھی :۔ میں نے اسے نہ اپنا جانشین بنانے میں مدد دی نہ اور کچھ

منڈی بہاؤالدین — انور دانش

بجٹ کا اعلان ہوتے ہی شوگر انڈسٹری میں بحران پیدا ہو گیا، شوکت

سب سے زیادہ بوجھ مزدور طبقے پر پڑا ہے — !

شوگر ملز ایمپلائز فیڈریشن پنجاب کے صدر شوکت حسین نیازی نے سال رواں کے بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ عام آدمی کی زندگی پر بوجھ پڑا ہے لیکن شوگر انڈسٹری کا مزدور بھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوگا گنجائش ٹیکس کا نظام ختم کرنے سے اس کے مسائل بڑھیں گے۔ مِل مالکان کے مطالبات کی بنیاد پر مزدوروں کے ساتھ کشیدگی بڑھے گی اور جس طرح ٹیکسٹائل انڈسٹری حکومت اور سرمایہ داروں کی ملی بھگت سے بحران کا شکار ہوئی تھی اسی طرح شوگر انڈسٹری کا بحران بھی اس بجٹ کے بعد شروع ہو گیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ جس طرح ٹیکسٹائل انڈسٹری کا سرمایہ دار الزام دیتا رہا ہے کہ مزدور کام نہیں کرتا اس لئے پروڈکشن میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح شوگر انڈسٹری کا سرمایہ دار بھی مزدور پر الزام دے گا۔ حالانکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گنجائش ٹیکس ختم کرنے سے سرمایہ دار کے منافع میں کمی ہوگی تو وہ ضرور الزام دے گا۔ اپنے منافع کی کمی کو دور کرنے کیلئے وہ بلیک مارکیٹ کرے گا۔ مزدوروں کی بڑے پیمانے پر چھانٹیاں ہوں گی۔ فیکٹریاں وقت سے پہلے بند کر دی جائیں گی۔ اور مزدوروں کے حقوق کو پائمال کرتے ہوئے سرمایہ دار اپنا سرمایہ کسی اور منافع بخش کاروبار پر خرچ کرے گا۔

شوکت نیازی نے کہا کہ فوجی حکومت نے سابقہ حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی ہے کہ شوگر انڈسٹری کا گنجائش ٹیکس کا نظام ناقص تھا جس کی وجہ سے چینی کی پیداوار میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ بات سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ میں پچھلے سات سالوں کی پیداوار کے اعداد و شمار پیش کرتا ہوں۔

سال	پیداوار
۱۹۷۱-۷۲ء	۳۲۲۹۷۵٫۱۶ ٹن
۱۹۷۲-۷۳ء	۴۱۰۱۵۴٫۲۱ ״
۱۹۷۳-۷۴ء	۵۴۲۲۸۲٫۱۱ ״
۱۹۷۴-۷۵ء	۴۱۱۱۴۷٫۰۰ ״
۱۹۷۵-۷۶ء	۶۲۸۷۳۴٫۹۸ ״
۱۹۷۶-۷۷ء	۷۳۶۳۰۱٫۶۰ ״
۱۹۷۷-۷۸ء	۸۴۶۱۲۲٫۹۵ ״

ان اعداد و شمار سے گزشتہ سالوں میں ملک میں تقریباً ۵ لاکھ ٹن چینی زیادہ پیدا ہوئی اور ملک چینی کی پیداوار میں خود کفیل ہو گیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ پیداوار میں گنجائش ٹیکس میں چھوٹ تھی اور سرمایہ دار دور دراز سے گنا خرید کر کے پیداوار میں اضافہ کا موجب بنتا تھا۔ لیکن اب حالات اس کے برعکس ہیں کہ جب وہ ہر پوری پر ٹیکس دے گا تو وہ زائد سرمایہ خرچ کر کے دور دراز سے گنا نہیں خریدے گا۔ کیونکہ سرمایہ دار کو صرف اپنے منافع کا لالچ ہوتا ہے اسے ملکی پیداوار سے کوئی غرض نہیں ہوتی اگر پچھلی پالیسی بحال نہ کی گئی تو شوگر انڈسٹری زبردست بحران کا شکار ہو جائے گی اور یہاں کا سرمایہ دار اگلے سال (۱۹۷۸-۷۹ء) میں لاکھوں ٹن چینی کی پیداوار میں کمی کرے گا، اور میرا دعویٰ ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہمیں اپنی ضروریات کے لئے چینی باہر سے منگوانی پڑے گی۔

انہوں نے کہا کہ پہلے ہی شوگر انڈسٹری کے مزدوروں پر ظلم و تشدد کیا جا رہا ہے۔ ٹریڈ یونینوں کے عہدیداروں پر قاتلانہ حملے کر کے جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا جا رہا ہے چھانٹیاں ہو رہی ہیں۔ اور مزدوروں کو گوناگوں مسائل کا سامنا ہے اس کے باوجود گنجائش ٹیکس کی چھوٹ ختم کرنے سے مسائل میں اضافہ کر نا مزدوروں پر سراسر ظلم ہوگا انہوں نے کہا کہ موجودہ حکومت مداخلت کرے اور ظلم و زیادتی کی اس فضا کو ختم کرے ورنہ پنجاب شوگر ملز ایمپلائز فیڈریشن اپنے ساتھیوں کی بحالی اور شوگر انڈسٹری مزدور کے تحفظ کے لئے جدوجہد کرے گی جس کا آغاز بھوک ہڑتال سے کیا جائے گا۔ اور اگر سرمایہ دار نے شوگر انڈسٹری سے ایک بھی مزدور کو نکالا تو اس سے جو بھی سنگین صورتِ حال پیدا ہوگی۔ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت اور سرمایہ دار پر عائد ہوگی۔

❀❀❀

سانگھڑ • سید عبدالرزاق

۸۵ فی صد آبادی کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے

مارشل لا کابینہ کے وزیر چودھری ظہور الٰہی نے اعلان کیا ہے کہ کچی آبادیوں کے مکینوں کو دو ماہ میں مالکانہ حقوق دیئے جائیں گے انہوں نے بھٹو حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اس فیصلے پر وعدے کے مطابق عمل نہیں کیا۔

چودھری صاحب بقول ان کے عوام کی خدمت کے جذبہ کے تحت مارشل لا کابینہ کے وزیر بنے ہیں۔ ورنہ وہ کرسی کے بھوکے نہیں ہیں۔ پاکستان کا ہر شخص چودھری صاحب کو جانتا ہے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ قوم کی "خدمت" سے ہی نٹ کانسٹیبل سے ارب پتی بنے ہیں۔ کل تک جو بھٹو حکومت کے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کو غیر قانونی اور دھوکہ کہتے تھکتا نہیں تھا آج مارشل لا کابینہ میں عوام کی مخالفت کے باوجود وزیر بن گیا ہے۔ خیر خدا کرے چودھری صاحب جونٹ کانسٹیبل سے آج پاکستان کا چوردروازے سے وزیر بن گیا ہے اپنے اعلان کو عملی جامہ پہنا لے

دراصل مخلوط حکومت نے اپنے آخری دنوں میں کچی آبادیوں کو منتقل کرنے اور ان میں آباد افراد کو مالکانہ حقوق دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا نہ صرف یہ بلکہ دیہات

میں آباد کسان اور محنت کش کو بھی رہنے کے لئے مفت زمین دینے کا فیصلہ ہوا تھا اور اس سلسلہ میں پنجاب میں کچھ کام ہوا لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بھٹو حکومت کو ختم کر دیا گیا۔

کچی آبادیوں کو مستقل کرنے اور آباد افراد کو مالکانہ حقوق دینے کے سلسلے میں چوہدری ظہور الٰہی نے واضح اعلان نہیں کیا ہے اور نہ ہی دیہی آبادی کو رہائشی زمین دینے کے لئے اعلان کیا حالانکہ پاکستان کی ۸۵ فی صد آبادی دیہات میں ہے اور خاص طور پر سندھ میں کسانوں کی حالت قابلِ رحم ہے صوبہ سندھ ہی وہ صوبہ ہے جس نے سب سے پہلے پاکستان کی قرارداد منظور کی اور ہندوستان سے تمنے والوں کو فراخدلی سے سینے سے لگایا ۵۰ فیصد مہاجرین کو سندھ میں آباد کیا لیکن وہ خود جن کی اکثریت دیہی علاقے میں رہتی ہے بے گھر ہے۔ تیس سالہ دور میں صرف بھٹو حکومت کے دور میں دیہی محنت کشوں کے لیے کچھ کام ہوا صوبہ سندھ میں نوے فیصد کسان اور مزدور جھنگیوں میں آباد ہیں اور وہ بھی زمیندار، جاگیردار کے رحم و کرم کی وجہ سے کیونکہ اگر زمیندار ناراض ہو جاتا ہے تو اس کی جھونپڑی اکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے۔

چوہدری ظہور الٰہی اور مارشل لاء انتظامیہ کو اگر عوام کا خیال ہے تو سب سے پہلے ان کسانوں کو آباد کرنا چاہیئے جو بے گھر ہیں۔ شہری آبادی میں لوگ کم سے کم گھروں میں آباد تو ہیں اور بہت سی سہولتوں سے مستفید ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو مالکانہ حقوق نہ دیئے جائیں اس کے علاوہ دیہی افراد کو ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے ان کی آمدنی کے مطابق قسطوں پر قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ مکان بنا کر اپنا اور اپنے اہل عیال کا سر چھپا سکیں۔ پاکستان پوری قوم کا ہے لیکن یہ بدقسمتی رہی کہ تمام حکومتیں صرف شہر والوں کی خوشنودی میں لگی رہیں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن یا دیگر اداروں کے قرضوں کی تفصیل دیکھی جائے تو دیہی آبادی کو ۸۵ فیصد ہونے کے باوجود ۱۰ فی صد قرض یا امداد دی گئی جبکہ شہری آبادی ۱۵ فیصد ہونے پر ۹۰ فی صد امداد اور قرض حاصل کرتی رہی پاکستان زرعی ملک ہے اس کے زرمبادلہ بھی زراعت سے تعلق رکھنے والے شعبوں سے تعلق رکھتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس ملک کا مالک کسان اور مزدور ہے لیکن وہ بھوکا ننگا اور بے گھر ہے۔

■

قتل کے ملزم اور مارشل لاء کے وزیر کے اعزاز میں استقبالئے جائز اور پروگریسیو طلبا لیڈروں کے استقبالئے جرم بن گئے

انقلابی محاذ طلباء کے محفوظ ملک گرفتار متعدد کے وارنٹ گرفتاری

انقلابی محاذ طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے کنوینر محفوظ احمد ملک کو پنجاب پولیس نے شکرگڑھ (ضلع سیالکوٹ) میں کمرۂ امتحان سے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ بی۔اے کا امتحان دے رہے تھے۔ انہیں مارشل لاء حکام کے آرڈر پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے طالب علم رہنما غلام عباس کو گرفتار کرنے پولیس ان کے گھر سیالکوٹ گئی اور ان کے والد کو حراست میں لاہور لے آیا گیا۔ جہاں انہیں تین روز حبس بیجا میں رکھا گیا۔ شادمان کالونی لاہور میں ان کے بھائی کی فرنیچر کی دکان کو سیل کر دیا گیا۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے صدر سیف اللہ سیف کی گرفتاری کے لئے پولیس ان کے گاؤں گئی اور ان کی والدہ کی توہین کی۔ بعد ازاں ان کے والد کو تھانے لے جا کر گولیاں مارنے کی دھمکی دی گئی۔ انقلابی محاذ طلبہ پنجاب کے کنوینر تقی نایاب کو گرفتار کرنے کے لئے ہاسٹل نیشنل کالج آف آرٹس پر چھاپہ مارا گیا اور اب پولیس جگہ بہ جگہ غیر متعلقہ لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔

پنجاب کے ان طالب علم رہنماؤں کے خلاف یہ تمام کاروائی اس عظیم الشان استقبالیے کا شاخسانہ ہے جس کا اہتمام ۱۳ جولائی کو پنجاب یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنماؤں کے اعزاز میں انقلابی محاذ طلبہ پنجاب، نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب، ترقی پسند محاذِ طالبات لاہور اور سوشلسٹ سٹوڈنٹس لیگ نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ پنجاب کے باشعور طالب علموں نے پہلی بار اپنے پختون، بلوچ اور سندھی بھائیوں کو خوش آمدید کہا تو "سالمیت پاکستان کی رٹ لگانے والوں" کو آگ لگ گئی اور میزبان طالب علم رہنماؤں پر مارشل لاء ضابطہ ۱۳ کے تحت مقدمات قائم کر دیئے گئے۔ اور اب پنجاب پولیس نے ان کا جینا حرام کر رکھا ہے۔

جس استقبالیہ کے سلسلے میں یہ مقدمات قائم کئے گئے ہیں وہ ایک عظیم الشان تقریب تھی۔ کیفے ٹیریا کا ہال طلباء، دانشوروں، صحافیوں، محنت کشوں اور خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پنجاب کے باشعور بیٹے اور بیٹیاں اپنے بلوچ، پختون اور سندھی بھائیوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ تقریب کا آغاز ۵ بجے شام ہونا تھا کہ ۳ بجے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے ترقی پسند طلباء کو دھمکیاں دیں اور کیفے ٹیریا کی بکنگ منسوخ کر دی۔ پنجاب یونیورسٹی کے

بلوچ، پختون اور سندھی طالب علم رہنماؤں کے میزبانوں پر مارشل لاء کے تحت مقدمات قائم کر دیئے گئے

ترقی پسند طلبا نے وائس چانسلر پر واضح کر دیا کہ وہ دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے مہمان ساتھیوں کی توہین برداشت نہیں کریں گے اور اپنے پروگرام کی تکمیل کریں گے خواہ نتائج کچھ بھی ہوں۔ آخر وائس چانسلر کو مجبوراً طلبہ اتحاد کے سامنے جھکنا پڑا۔ ۶ بجے تقریب کا آغاز ہوا جو تین گھنٹے سے زائد جاری رہی۔ موسم گرما کی تعطیلات کے باوجود اتنے لوگ اکٹھے ہو گئے کہ میزبان تنظیموں کو مجبوراً ہال چھوڑ کر لان میں بندوبست کرنا پڑا۔ استقبالیہ نے ایک جلسے کی صورت اختیار کر لی۔ دراصل مارشل لاء حکومت کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ترقی پسند طلبا کا یہ پہلا عظیم الشان اکٹھ تھا جس میں کھل کر انہوں نے اپنے سیاسی موقف کا اظہار کیا اور پھر پختون، بلوچ، سندھی ساتھیوں کی موجودگی نے اُسے دوچند کر دیا۔

تقریب کی صدارت پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر جناب شیر محمد نے کی۔ ان کے علاوہ سٹیج پر بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی سنٹرل کمیٹی کے رکن جناب رحیم بخش، سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جبار خٹک اور نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے صدر سیف اللہ سیف موجود تھے۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض انقلابی محاذ طلبہ پنجاب کے کنوینر جناب نقی نایاب نے انجام دیئے۔

انقلابی محاذ طلبہ پنجاب کے کنوینر جناب نقی نایاب نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے باشعور سپوتوں کے اس عظیم الشان اجتماعؑ جوش، ولولے اور پختون، بلوچ، سندھی ساتھیوں کے لئے بے پناہ دلی محبت نے ثابت کر دیا ہے کہ آج نفرت کی ان دیواروں کے درمیان پہلا شگاف پڑ گیا ہے جو ظالم حکمرانوں، مضبوط مرکز کے دلالوں اور مظلوم قومیتوں کے وڈیروں نے مل کر پنجابی اور دیگر قوموں کے عوام کے درمیان کھڑی کر دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ مظلوم قومیتوں کی قومی حقوق کی لڑائی اور جمہوریت کے لئے دلیرانہ جدوجہد کے نتیجے میں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے کہ آج پنجاب کے عوام بھی قومی جبر کے خاتمے اور جمہوریت کی جدوجہد میں دیگر قومیتوں کے عوام کے ساتھ ایک لڑائی میں پروئے گئے ہیں اور آمریت کے خاتمے کے لئے پیش پیش ہیں۔ انہوں نے کہا پاکستان کے عوام کو سامراج کے عذاب سے نجات دلانے اور ایک آزاد و خوشحال سماج کے قیام کی جدوجہد اور ملک میں عوام کا اقتدار قائم کرنے کے لئے بائیں بازو کا سیاسی تشخص اور تنظیم وقت کی اہم ضرورت ہے اور نوجوان عنصر اس میں نہایت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ آج کا اجتماع طلبہ کے مسائل کے حل، قومی جبر کے خاتمے اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والے نوجوانوں کو متحد کرنے کے لئے پہلا قدم ثابت ہو گا۔

نقی نایاب کے بعد نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے صدر سیف اللہ سیف نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے ظالموں کے ناپاک گٹھ جوڑ کے خلاف ہمیں تمام قوموں کے محنت کشوں اور باشعور نوجوانوں کا اتحاد قائم کرنا ہے۔ قومی حقوق کی لڑائی اور جمہوری جدوجہد کو ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کی جدوجہد کا حصہ بنانا ہے۔ اس لئے ہم بلوچ پختون اور سندھی عوام کی جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھتے ہیں اور اسے متحد و منظم کرنے کے لئے پوری قوت صرف کر دیں گے۔ انہوں نے کہا یہ بہادر بلوچ عوام کی قومی حقوق کی لڑائی اور جمہوریت کے لئے بے پناہ قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ملک بھر کے انقلابیوں کے ہیرو ہیں اور پنجاب کی سرزمین پر چند ایسے لوگ بھی انہیں خوش آمدید کہنے پر مجبور ہیں جو کل تک ظالموں کی گود میں بیٹھے تھے انہوں نے کہا لاہور کے طالب علموں کے اتحاد" طلبہ مجلس عمل" میں شامل تنظیموں این ایس ایف پنجاب، انقلابی محاذ طلبہ پنجاب اور ترقی پسند محاذِ طالبات نے نہ صرف ہمیشہ مظلوم قومیتوں کے حقوق کے لئے آواز بلند کی ہے بلکہ ان پر ہونے والے جبر کی بھرپور مخالفت کی ہے۔

ترقی پسند محاذِ طالبات کی محترمہ توصیف اختر اور دُرِّ بخت زیدی نے اپنی تقاریر میں کہا کہ وہ منصفانہ سماج کے قیام کی جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ شامل ہوں گی اور اپنے بلوچ، پختون، سندھی اور پنجابی بھائیوں کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چلیں گی۔

سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جناب ساغر سیمجو نے اپنی تقریر کا آغاز جیئے سندھ، جیئے بلوچ، جیئے پختون اور جیئے پنجاب سے کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں سندھی قوم پر مسلط کی گئی پسماندگی اور ان کے قومی حقوق سلب کئے جانے کا تفصیلاً ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وردی پوش سندھ کے گوٹھوں کو روندتے پھر رہے ہیں۔ وہ راتوں کو گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور غریب ہاریوں کی مرغیاں تک چھیننے سے گریز نہیں کرتے۔

ان کے بعد بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے جناب رفیق کھوسو نے کہا کہ آج پنجاب کو میں اپنا گھر محسوس کر رہا ہوں اور یہاں کے عوام کے شعور کی مثبت تبدیلی نے مجھے بے پناہ متاثر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج سے چند سال قبل اسی زمین پر کوئی ہماری آواز سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پنجاب یونیورسٹی ہی میں ہمارا جلسہ گڑبڑ کر دیا گیا تھا۔ لیکن آج پنجاب کے ساتھیوں کا یہ والہانہ استقبال اور دوستی کا جذبہ ایک مثبت تبدیلی کی نوید دیتا ہے۔

پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر جناب شیر محمد نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے انقلابی دوستوں اور طالب علموں کی بے پناہ محبت اور دوستانہ استقبال نے ہمیں وہ بے پناہ مسرت اور خوشی بخشی ہے کہ اگر میں الفاظ میں ان کا احاطہ نہ کر سکوں تو آپ مجھے معاف فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ آج پاکستان تبدیلی کے بہت بڑے دور سے گذر رہا ہے۔ دنیا میں ایک انقلابی لہر اُٹھ رہی ہے۔ ہمارے ارد گرد کے علاقوں میں عوام عظیم الشان کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ افغان عوام نئی زندگی کی راہ پر آگے بڑھ رہے ہیں ایران کے نوجوانوں اور عوام نے شاہی بوجھ سر سے اتارنے کے لئے گردنیں سیدھی کر لی ہیں۔

پاکستان میں بھی ریاستی ڈھانچہ جتنا کمزور اور کھوکھلا آج ہے کبھی نہیں تھا۔ حکمرانوں نے اسی گھبراہٹ میں بائیں بازو کے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں شروع کر دی ہیں۔ افراسیاب خٹک، مسلم شاہ اور عبدالوحید کو صوبہ سرحد سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہشت نگر اور مالاکنڈ میں کسانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ صوبہ سرحد میں سائنسی کتب پڑھنے پر لوگوں کو جیل بھیجا رہا ہے اور ان پر کفر کے فتوے صادر کئے جا رہے ہیں۔ لیکن

قومی محاذ آزادی کے جناب قیصر ملک نگری اور ترقی پسند محاذِ طالبات کی محترمہ دُرِّ بخت زیدی نے انقلابی تنظیمیں ینابتی

پنجاب کے طالب علم رہنماؤں پر مارشل لاء کے تحت قائم کئے گئے مقدمات اور انقلابی محاذ طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے کنوینر محفوظ احمد ملک کی گرفتاری پر متعدد مزدور اور طالب علم تنظیموں نے احتجاج کیا ہے اور پولیس کاروائی کی سخت مذمت کی ہے۔ نیز حکومت سے مقدمات ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مہمان طلبہ کو پنجاب میں استقبالیہ دینے کی ایک طرف تو ترقی پسند طالب علم رہنماؤں کو یہ سزا دی جا رہی ہے۔ دوسری جانب اسی شہر میں برکات احمد شہید کے مبیّنہ قاتل جاوید ہاشمی کو آئے دن استقبالیے دیئے جا رہے ہیں اور حکومت ان کا نوٹس لینے کی بجائے پشت پناہی کر رہی ہے۔ ترقی پسند طالب علم رہنماؤں نے کہا ہے کہ وہ حکومت کے ان ہتھکنڈوں سے ہراساں یا مرعوب نہیں ہوں گے اور مختلف قومیتوں کے طلبہ اور عوام کے اتحاد کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

یہ مشترکہ بیان پنجاب مزدور رابطہ کمیٹی کے صدر ضیاء الدین بٹ، متحدہ مزدور مجلس عمل کے صدر محمود بٹ سکریٹری جنرل گلزار چوہدری، مزدور کمیٹی جی ٹی روڈ کے صدر اور راوی ریان ملز کے سکریٹری محمد اسلم، خوانچہ کھوکھا ورکرز فیڈریشن کے صدر روزی خان، مزدور کسان پارٹی (ورکرز) پنجاب کے کنوینر صوفی صبغت اللہ لاہور کے کنوینر بشیر وردی، قومی محاذ آزادی لاہور کے کنوینر ارشد بٹ، راولپنڈی کے کنوینر خواجہ سلیم جوائنٹ لیبر ایکشن کمیٹی کے رہنما لقمان مرزا واہ آرڈی ننس فیکٹری ورک مین ایسوسی ایشن کے صدر عبدالغفار خان این ایس ایف پنجاب کے صدر سیف اللہ سیف انقلابی محاذ طلبہ پنجاب کے کنوینر تقی نایاب فیڈریشن آف پنجاب اسٹوڈنٹس یونین کے صدر سلیم شاکر، سوشلسٹ اسٹوڈنٹس لیگ کے صدر ہارون الرشید نے جاری کیا اس کے باوجود وہ تاریخ کا دھارا نہیں موڑ سکتے۔

اس کے علاوہ استقبالیئے سے این ایس ایف پنجاب کے طالب علم رہنما غلام عباس، سوشلسٹ اسٹوڈنٹس لیگ اسلام آباد کے گل خان۔ مزدور کسان پارٹی (ورکرز) کے بشیر وردی، مزدور رہنما روزی خان، قومی محاذ آزادی لاہور کے کنوینر ارشد بٹ، نشتر میڈیکل کالج اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری جنرل شاہد رانا اور انقلابی محاذِ طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے کنوینر محفوظ ملک نے تقاریر کیں۔

گوجرانوالہ

میں زراعت کے متعلق کچھ نہیں جانتا فوجی وزیر زراعت کا اعتراف

محمد افضل بجوہ

وزیر خوراک کی دعوت مہاراجہ پٹیالہ کا دسترخوان بن گئی

مجھے فوج کا ایک دستہ مہیا کیا جائے

چوہدری صادق کا مطالبہ

فوجی حکومت کے تازہ تازہ نامزد وزرائے کرام میں سے اوپر تلے تین وزیر باتدبیر ہمارے شہر میں تشریف لا چکے ہیں۔ "جمہوریت کے معروف چیمپئن خواجہ صفدر مارشل لاء کے وزیر برائے زراعت وخوراک نے سب سے پہلے قدم رنجہ فرمایا۔ انہوں نے سرِراہ کاموں کی کے ایک ہائی اسکول، گوجرانوالہ کے ڈسٹرکٹ کونسل ہال اور گوجرانوالہ کے چوٹی کے رئیس اور زمیندار سید کاظم علی کی کوٹھی میں کارکنوں اور کاشتکاروں سے خطاب کیا۔ ان کے اعزاز میں مقامی انتظامیہ نے تقریباً ڈیڑھ سو بڑے بڑے پرانے مسلم لیگی زمینداروں کو کاشتکاروں اور کسانوں کے نام پر جمع کیا خواجہ صاحب نے ان سے خطاب کرتے ہوئے بڑی فراخدلی سے اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ زراعت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ حاضرین نے کھاد، بیج اور ٹریکٹروں کے حصول میں اپنی مشکلات کی ان سے شکایتیں کیں، ٹیوب ویلوں کے لیے بجلی کے کنکشنوں کی بات ہوئی تو خواجہ صاحب نے کہا کہ واپڈا کا ہر اہلکار راشی ہے مگر صورتحال کو بہتر بنانے کے لیئے انہوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔

خان غلام دستگیر خان کی کوٹھی پر ان کے اعزاز میں ایک پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ دستگیر صاحب گذشتہ ادھورے رہ جانے والے انتخابات میں قومی اسمبلی کے لیئے قومی اتحاد کے امیدوار تھے اور آجکل صوبائی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھانے کے لیئے اپنی نیند حرام کیے ہوئے ہیں اسی لیئے انہوں نے لنچوں، ڈنروں اور اخباری بیانوں پر خاصا زور دے رکھا ہے۔ شاید اسی طرح ان کی وزارتی لاٹری نکل آئے ہاں تو بات ہو رہی تھی خواجہ صاحب کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت کی اس دعوت میں اتنے لذیذ اور رنگارنگ کے کھانے برائے تناول ماحضر تھے کہ ہمارے اپنے خیال میں ریاست پٹیالہ کے مہاراجہ کے دسترخوان پر بھی کبھی ایسے اور اتنی قسم کے کھانے نہیں چنے گئے ہونگے دستگیر صاحب شوقِ میزبانی میں سی ایم ایل اے کے اس فرمان کو بھی نظرانداز کر گئے جس کا ذکر انہوں نے پہلے ٹی وی پر تقریر کرتے ہوئے کیا تھا کہ ایک وقت میں دو قسم کے کھانوں سے زیادہ کھانے اپنے دسترخوان پر کوئی نہ سجائے۔ قطع نظر اس کے پاکستان کے عوام کو ایک وقت میں دو قسم کے کھانے تو کجا مٹھی بھر آٹے کے لیئے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے جنرل صاحب کی یہ تجویز، فرمان، ہدایت یا جو کچھ بھی تھا برا نہ تھا جسے گوجرانوالہ کے رئیس اعظم اور صوبائی وزارت کا حلف اٹھانے کے امیدوار نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور نہ ہی جنرل صاحب کے وزیر نے اپنے محترم میزبان کو ٹوکنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔

اس شہنشاہی دعوت سے لطف اندوز ہونے کے بعد گوجرانوالہ کے دوسرے بڑے رئیس سید کاظم علی کی کوٹھی پہنچکر مسلم لیگ کے بعض منہ زور اور بے باک کارکنوں نے خواجہ صاحب سے بڑے تیکھے اور جرأتمندانہ سوال کیئے۔ جن کا عدم فرصت کی وجہ سے خواجہ صاحب کوئی تفصیلی اور تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ خواجہ صفدر نے اپنی جماعت مسلم لیگ کے کارکنوں کو یہ ضرور بتایا کہ انہوں نے وزارت کی خاطر اپنی چالیس سالہ سیاسی زندگی داؤ پر لگادی ہے۔

چوہدری ظہور الٰہی نے اپنے باقاعدہ دورے سے گوجرانوالہ کے عوام کو محظوظ نہیں فرمایا۔ تاہم وہ اپنے گھر گجرات جاتے ہوئے ہمارے شہر کے آنگن میں سے ہو کر ضرور گزرے عین دوران سفر وقتِ نماز آگیا چوہدری صاحب نے شہر کے سب سے بارونق حصے میں داخل ہوتے ہی اپنی سرکاری کاروں کو رک جانے کا حکم دیا اور جی ٹی روڈ پر برلب سڑک مسجد میں نماز کے لیے چلے گئے گوجرانوالہ کا ایک محمد انور نامی ایک غریب شخص مارشل لاء کے وزیر کے ساتھ نماز کی ادائیگی کا شرف حاصل کرنے کی خاطر بھاگ کر اگلی صف میں جا کھڑا ہوا۔ اس طرح ہمیں زندگی میں پہلی بار محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے دیکھنے نصیب ہوئے۔ "بڑا روح پرور نظارہ تھا دور حاضر کے محمود یعنی چوہدری صاحب نے دس بندوقیوں کے ہمراہ پولیس کے سنگین حفاظتی پہرے میں اپنا سر اللہ کے حضور جھکایا اور نماز سے فارغ ہو کر گجرات کی راہ لی۔ لیکن بے چارہ ایاز ایاز یعنی گوجرانوالہ کا وہ مقامی غریب شخص اپنے جوتے سے محروم ہو گیا۔ عجب اتفاق تھا جوتی سے محروم "ایاز" جب ننگے پاؤں سڑک پر اپنے گھر جا رہا تھا تو چوہدری صاحب اپنی عالیشان اور چمکیلی کار میں بیٹھے بڑی شان و شوکت کے ساتھ شہر کے بیچوں بیچ شاہراہ اعظم پر سے گزر رہے تھے۔ ان کے آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں اور آگے آگے گھگو بولتا جا رہا تھا جسے سائرن کہتے ہیں لوگوں کو کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے بھی اسے بجایا جاتا ہے۔

ابھی بے چارے عوام سوچ ہی رہے تھے کہ مارشل لاء کابینہ کے ارکان حکومت اور عوام کے درمیان واقع خلاء کو پُر کرنے آتے ہیں یا اس خلاء کو مزید وسیع و عریض کرنے کا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں کہ وزیر تجارت میاں زاہد سرفراز بھی ہمارے ہی شہر میں چلے آئے، انہوں نے صنعتکاروں، تاجروں، بینکاروں وغیرہ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کے علاوہ مقامی بار ایسوسی ایشن کے خصوصی اجلاس سے بھی خطاب کیا۔ میاں صاحب نے کہا کہ حکومت میں کئی ایسے وزیر بھی موجود ہیں جو اپنے محکمہ کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے انہوں نے کہا کہ ایسے وزراء اپنے محکموں کو چلانے کے ہرگز اہل نہیں ہیں۔

بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران ایک بڑا دلچسپ واقعہ رونما ہوا مقامی بار کے ایک معزز رکن چوہدری صادق علی ایڈووکیٹ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور میاں صاحب کو مخاطب ہو کر بولے "حضور! مجھے فوج کا ایک دستہ مہیا کیا جائے۔"

محفل پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میاں زاہد سرفراز خود بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دریافت کیا کہ آپ کو فوجی دستے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟ ایڈووکیٹ چوہدری صادق علی نے کہا۔ میں اس دستے کے ذریعے گوجرانوالہ کے ڈی سی اور ایس پی کو گرفتار کر کے جنرل ضیاء الحق کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میاں صاحب نے کہا کہ جو رشوت لیتا ہے اسے میرے سامنے لاؤ۔ چوہدری صادق علی بولے۔ جناب مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کو آپ کے سامنے لا سکوں۔ اسی لیے تو میں فوج کا دستہ طلب کر رہا ہوں۔

یاد رہے کہ جنرل ضیاء نے گذشتہ دنوں اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ راشی افسروں کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ تاکہ میں خود ان ملک دشمن افسروں کو رشوت لینے کا مزہ چکھاؤں۔

نظام مصطفےٰ کے نفاذ کے بارے میں ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں جناب زاہد سرفراز نے کہا کہ تمہیں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے کون روکتا ہے خدارا اب مذہبی ڈھکوسلوں کے ذریعے سیاست کرنا چھوڑ دو اور حقیقت پسندی سے کام لو۔ انہوں نے کہا اسلام تو چودہ سو سال پہلے آچکا ہے تم کس اسلام کے لانے کی بات کرتے ہو۔

سکھر

مارشل لاء کابینہ میں مسلم لیگ کی شمولیت ایک عوام دشمن اور جمہوریت کش اقدام

وکلاء کی جانب سے آزادی صحافت کی تحریک میں شامل ہونے کی پیشکش

سکھر ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ۳۳ ارکان نے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے۔

● اخباری اطلاعات کے مطابق مسٹر بھٹو کے سینیئر وکیل مسٹر یحییٰ بختیار نے بتایا ہے کہ بھٹو صاحب کے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھے گئے۔ ہم اس افسوسناک بات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں طبی سہولتیں فراہم نہ کرنے پر انتظامیہ کے رویے کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مسٹر بھٹو کو ان کی خواہش کے مطابق علاج فراہم کیا جائے۔

● ہم پریس اور مطبوعات پر خصوصاً مسٹر پلیجو کی سندھی تصنیفات "صبح تھیندو" اور "دھرتی دھک" پر حالیہ پابندی کی مذمت کرتے ہیں اور پریس کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم پریس اور مطبوعات کی آزادی کے لئے فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی تحریک کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ پی ایف یو جے کے ایک اشارے پر ہماری تنظیم کے اراکین رضاکارانہ طور پر اس تحریک میں شامل ہو جائیں گے۔

● ہم عام انتخابات کے بغیر مسلم لیگ کی حکومت میں شمولیت کی عوام دشمن اور غیر جمہوری پالیسیوں کی مذمت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس قدم سے انتخابات مزید التواء میں پڑ جائیں گے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ نام نہاد سول حکومت میں شمولیت کرنے والے سیاستدانوں پر آنے والے عام انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی جائے۔ ہم عام انتخابات سے پہلے بلدیہ کے انتخابات کرانے کی تجویز کو بھی مسترد کرتے ہیں۔ عوام اور ملک کے مفاد میں پہلے عام انتخابات کرائے جائیں۔

● ہم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو ان کا انتخاب کرانے کا عہدِ مصمم اور نوے دن کا نام نہاد "آپریشن فیئر پلے" یاد دلاتے ہیں اور سیاسی سرگرمیوں کی فوری بحالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

● ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام سیاسی کارکنوں، طلبہ، ٹریڈ یونین والوں اور ہماری تحریک کے کارکنوں کو جنہیں نام نہاد حفاظتی قوانین کے تحت گرفتار کیا گیا ہے، رہا کر دیا جائے

چھوٹا منہ بڑی بات

ابو ضیاء اقبال

جناب رفیق ڈوگر "نوائے وقت" کے کالم "دید شنید" (۱۹ جولائی) میں جناب نوابزادہ نصر اللہ خان کے بارے میں رقمطراز ہیں:- "ان کی سیاست اختلاف کی سیاست ہے ان کی زندگی بھر کی سیاست اور سیاسی خدمات کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو آپ انہیں پاکستان کا بابائے اختلاف مان لیں گے۔"

صاحب! بڑا جگر ہے جناب رفیق ڈوگر کا کہ برسہا برس تک اس واردات کو یوں سینے میں چھپائے رہے جیسے خان غفار خان پاکستان سے محبت کو ۱۹۷۸ء تک دل میں چھپائے پھرتے رہے حتیٰ کہ یہ انکشاف اس وقت بھی نہ ہوا جب جناب نوابزادہ کو پی این اے کا نائب صدر چُنا گیا۔

ایسا ہی ایک چوندا چوندا انکشاف جناب اصغر خان نے ۱۷ جولائی کو راولپنڈی میں فرمایا کہ مسلم لیگ اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے" (روزنامہ حریت ۱۸ جولائی) اگر موصوف اس سانحے کی تعریف دن اور وقت بھی بتا دیتے تو ان لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا جو اسے اس کی پاکستان میں ہجرت کے روز سے جانتے ہیں۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ "استقلال" جیسی ٹھوس شے سے تقریباً سال بھر پیوند کیسے رہ سکا۔ اور پیوند کاری کے دور میں ٹھوس اور کھوکھلی لوادیں مگر دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹتی کس طرح رہی!

جناب نورانی بھی پاکستان والوں کے لیے ۱۷ جولائی کو صاحبِ انکشاف ہوئے کہ "اب تو یہ بات لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو گئی ہو گی کہ کن پارٹیوں کا منتہائے مقصود اسلام آباد تھا (حریت ۱۸ جولائی) مولانا بھول رہے ہیں کہ اسلام کو جاتے عرصے (نعوذ باللہ) خاصا برباد تھا۔ آباد کرنے کے لیے اسلام آباد بے حد ضروری ہے خیر یہ جملہ معترضہ ہے۔ اصل بات انکشافات میں تاخیر کی ہے اگر یہی کیفیت رہی تو کوئی دن جاتا ہے کہ کچھ محرومینِ اقتدار انتخابات میں تاخیر کی طرح انکشافات میں تاخیر پر بھی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے

ایک انکشاف محترمہ ام ۔ بریگیڈیئر ٹی ایم سلامی پاکستان حلقہ خواتین نے بھی کیا ہے کہ "کچھ اوپر والوں نے محترم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی ہر بات کے خلاف چلنے کا تہیہ کر رکھا ہے (جسارت ۲۰ جولائی) یہ "اوپر والوں" کا معمہ کچھ پلے نہیں پڑا جنرل صاحب کے اوپر تو بقول ان کے خدا اور ساتھ ان کا ضمیر ہے۔ ان نیچے والوں کی بات ہوتی تو درست بھی تھی لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہو گا کہ نیچے کون ہیں؟

انکشاف کی رعایت سے علامہ اظہر حسین زیدی کا تذکرہ بھی دیدۂ عبرت نگاہ کے لیے بے محل نہ ہو گا۔ موصوف نیشنل سنٹر لاہور میں ذکر حسین کی مجلس سے خطاب کرتے ہوئے گویا ہوئے" وہ (جاوید ہاشمی) ہاشمی النسل ہے اور اس طرح سید الشہداء سے ایک نسبت رکھتا ہے اور امام حسینؑ جاوید تھے ..... جاوید ہاشمی کہہ سکتا ہے کہ وہ کم از کم نام کی حد تک ان سے تعلق رکھتا ہے جو کرۂ ارض کے عظیم ترین لوگ تھے" (رپورٹ بادبان)

علامہ مذکور ایک ممتاز شیعہ عالم ہیں لہٰذا لب کشائی سوئے ادب ہے البتہ ایک سوال ہے کہ سید الشہدا کے نام سے مناسبت رکھنے والے کے مقابل اس دور میں یزیدیت سے مناسبت رکھنے والے کون ہیں۔؟

انکشاف کی بات چل نکلی ہے تو ایک اور کشف عالمی شہرت رکھنے والے فلمی اداکار مارلن برانڈو نے واشنگٹن میں کہا کہ:- "مجھے حیرت ہوتی ہے امریکی وزیر خارجہ کس منہ سے دنیا کا دورہ کرتے ہیں اور صدر و نائب صدر کس منہ سے انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ کرتے ہیں (نوائے وقت ۱۸ جولائی) لیکن صاحب یہ کشف مشکوک ہے کیونکہ ایک اداکار یہ ہوا ہے جسے سیاست کاری سے کوئی علاقہ نہیں ہے جو لوگ امریکی نہیں ہیں یا امریکی ہیں لیکن اداکاری سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ اسے انکشاف ہرگز نہیں مانیں گے وہ اسے نظریۂ ضرورت قرار دیں گے مارلن برانڈو کی غیرت پر حیرت ہے کہ انہیں بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی کہ سیاست کاری میں اداکاری کی ملاوٹ کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنے ۔۔ ان کے حوالے سے نہیں ذرا بھی غیرت ہالی وڈ نے ۔ ملک کا جس نے انہیں عزت، دولت اور شہرت دی! عجب احسان فراموش آدمی ہے!

نائن انکشافات کے طور پر پاکستان کے دو نجومی حضرات جناب ایس ایم رشید اور جناب غازی کا دعویٰ اول الذکر کا ارشاد ہے کہ موجودہ کابینہ صرف چھ ماہ رہے گی اور موخر الذکر فرماتے ہیں کہ سول حکومت کا قیام بہتر نہ ہو گا (حریت ۲۰ جولائی)

ان دونوں پیشگوئیوں کو ملا کر پڑھا جائے تو دو صورتیں بنتی ہیں۔ ایک یہ کہ سول حکومت کا قیام بہتر نہ ہو گا اور وہ صرف چھ ماہ رہے گی۔ دوسری یہ کہ موجودہ کابینہ چھ ماہ میں ملک کا دھڑن تختہ کر کے چلتی بنے گی یہ دونوں پیشگوئیاں پوری ہوں نہ ہوں لیکن دونوں منجم صاحبان کا ناطقہ ضرور بند ہو جائے گا۔ اس ضمن میں جناب واحد بشیر کا یہ شعر بھی انکشاف کی ذیل سے خارج نہ ہو گا ؎

دیکھو حصارِ ذات میں رخنے ہیں کس قدر
پرچھائیاں بھی بولتی ہیں، غور سے سنو

چلتے چلتے ایک تازہ ترین انکشاف بھی لیتے جائیے مسلم لیگ کے نائب صدر جناب ایس ایم ظفر کا حکم (جی ہاں حکم) ہے کہ موجودہ کابینہ میں شامل وزراء جن کے پاس کوئی اور سرکاری عہدہ بھی ہو انہیں سابقہ سروس سے مستعفی ہونا چاہیے (نوائے وقت ۳ اگست) اشارہ کس طرف ہے؟ ؎

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

بقیہ: حسین نقی

متعلق عجیب و غریب باتیں بتائیں یہ غالباً ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے اس فلم کو ہمارے امریکہ میں دکھایا گیا امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ یعنی حکومت نے بھی اس فلم کی بڑی پذیرائی کی، پھر ایک مرتبہ کوئی ویتنامی حکومت کا مہمان ہوا تو اسے بھی امریکی صحافیوں کی شمالی ویت نام کے قریب بالکل قریب اس عظیم صحافیانہ کارنامے کی فلم دکھائی گئی جب وہ دیکھ چکا تو اس نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا کہ یہ نرا فراڈ ہے۔

امریکی سرکار کے افسران نے پوچھا کیسے تو اس ویتنامی مہمان نے بتایا کہ فلم میں ترجمان نے پہلے اس ویت نامی بوڑھے سے کہا کہ اب تم تیار ہو جاؤ، جب میں تم سے کوئی سوال کروں تو تم سوچ میں پڑ جانے کا تاثر دینا اور پھر ویت نامی زبان میں دس تک گنتی گن دیا کرنا ورنہ تم مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ ساری فلم میں ایسا ہی ہوتا رہا۔ "بھیڑوں کی قوم" کے مصنف نے لکھا کہ کئی سال تک وہ فلم جس کو سرکار نے خرید کر مزید مشتہر کیا امریکی قوم کو دھوکا دیتی رہی اور جب اس دھوکہ کا پتہ چلا تو اس کے پہنچائے ہوئے نقصان کا ازالہ ناممکن تھا۔ اس لیے "بھیڑوں کی قوم" کے مصنف نے لکھا ہے کہ اگر امریکی "بھیڑوں کی قوم" نہیں رہنا چاہتے تو انہیں حقائق کو قابل اعتبار ذرائع سے چھان پھٹک کر قبول کرنا چاہیئے ایسا نہیں کرو گے تو "بھیڑوں کی قوم" رہو گے!!

میں نے کوئی پندرہ سال پہلے وہ کتاب پڑھی تھی کل پھر سے پڑھی کیونکہ مسلمان ہوں اور میرے جدِ امجد حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اچھی چیز جہاں بھی ہو وہ مسلمانوں کی یعنی ہماری اپنی ہے لہذا مولانا جارڈ ولبوچ صاحب جنہوں نے پچھلے سے پچھلے ہفتہ ایڈیٹر کے نام ایک خط میں میرے کالم پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ میں بہت زیادہ لکھ رہا ہوں اندلیسا لگتا ہے کہ میں جلدی میں ہوں اور میرے قلم کے روک دیئے جانے کا خطرہ ہے تو مولانا صاحب نہ میں بہت لکھ رہا ہوں نہ جلدی میں ہوں نہ میرے قلم کے روکنے رکھنے کی کسی اندیشہ کی مجھے اطلاع ہے اور جب مجھے اطلاع نہیں تو مولانا جارڈ ولبوچ صاحب کو کیونکر ہو گئی۔ برادرم یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ میں بہت لکھ رہا ہوں میں نے تو اب تک یہ بھی نہیں لکھا کہ کس نے کس کو لندن پہنچانے یا پاکستان سے کھسک جانے کی اجازت کس شرح پر دی۔؟ نہ ہی میں نے یہ لکھا کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے ملک محمد اختر سابق سٹین برادر وزیر قانون و دھاندلی باز لاہور کا نام اس سفید ہزار سے زیادہ صفحے کی کتاب میں کیوں نہیں آیا۔ میں کہ بچپن سے بزرگوں کا ادب کرنا سیکھا ہے یہ بھی آپ کو نہیں بتا سکتا کہ جن جید صحافیوں کی خدمات وہائٹ پیپر اور اس کے ضمیمہ کی تیاری کے لئے حاصل کی گئیں انہوں نے ملک اختر کو کیوں کر معاف کیا اور کس طرح انہوں نے الیکشن سے متعلق ضمیمہ میں الیکشن کے بعد کے واقعات کو شامل کر دیا۔ نہ ہی کبھی میں نے محمد حیات خان تمن اور پیر علی محمد راشدی کی موجودہ کارگزاریوں اور اپنی ہر آقا کے ساتھ نبرد آزمائی کی روایت کا تذکرہ کیا نہ ہی میں نے آپ سے یہ ذکر کیا کہ ریاست کے چار پایوں کو کہاں کہاں سے دیمک نے چاٹا، نہ ہی اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ کے عملی نظریات سے آپ کو روشناس کرایا حتیٰ کہ اب تک یہ وضاحت نہیں ہو سکی کہ بھٹو کے لیئے اسلام آباد جنت ارضی سے کوفہ کیونکر بن گیا۔

بھائی جان! ابھی تو اس کا ذکر تک نہیں ہوا کہ اسلامی نظام حیات اور تعزیرات کے نفاذ کے لئے مولانا کوثر نیازی اور چوہدری ظہور الٰہی کیوں بے چین ہیں اور ملک کے ان دو سب سے زیادہ ایماندار، مخلصین اسلام کے اسلامی کارنامے کیا کیا ہیں اور کہاں کہاں سرزد ہوئے اور ہوتے ہیں۔ ہم نے ابھی کیا لکھا ہے کہاں لکھا ہے کہ غریبوں اور بیواؤں کے ہمدرد سیٹھ عابد صاحب کو کیا کیا سہولتیں اور مراعات فراہم کی جا رہی ہیں اور کیوں کی جا رہی ہیں۔ اور تاحال ملک کی اولین نظریاتی سرحدوں کی محافظ اور اسلامی نظام کی علمبردار وزارت کے اراکین نے کیا کیا گل کھلانے شروع کیے ہیں۔

ذرا صبر کیجئے کہ موجودہ حکومت کے مرد آہن جنرل فیض علی چشتی نے فرمایا ہے کہ فوج اپنا بھی محاسبہ کریں گے، جنرلوں سے شروع کریں، ہماری درخواست ہے!! اچھا ہیں تو سابق جرنلوں سے ابتدا کر لیں ان سے بھی جو دو دو بار ریٹائر ہو کر تیسری بار ملازمت پر آ گئے ہیں۔ یا یہ نئی روایت کیوں نہ ڈالیں کہ جنرل فیض علی چشتی صاحب اپنے آپ سے ابتدا فرمائیں کہ ہم مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ نے خود احتساب کی تلقین ہے حتیٰ کہ جب رسول اکرم دعوت اسلام دینے کے لیے پہلی بار کھڑے ہوئے تو انہوں نے اپنے خطبے میں یہ پوچھا کہ کیا تم نے کبھی مجھے امانت میں خیانت کرتے پایا اور وہ جو مرتے دم تک ایمان نہ لائے انہوں نے بھی گواہی دی کہ محمدؐ ہم نے تم کو امین پایا۔

ویسے تو ان دنوں کافی اہم اور دلچسپ خبریں آپ نے پڑھی ہونگی اسلامی اخلاق کے مجسمے چوہدری ظہور الٰہی لاہور آئے ہوئے تھے انہوں نے منہاج برنا صاحب اور ان کے والد مرحوم کے لیئے انتہائی سلیس زبان استعمال فرمائی اور جنرل ضیاء الحق صاحب کی شریفانہ مخلوط حکومت کی پہلی جھلک دکھائی۔ ابھی چونکہ ہم نے "اسلام کا سپاہی ظہور الٰہی" کی اس بے ہودگی کے متعلق جنرل ضیاء صاحب سے درخواست کی ہے کہ برنا صاحب اور ان کے والد مرحوم کی شان میں گستاخیوں پر اسلامی اخلاق کے پیش نظر معافی مانگی جائے اس لیئے کچھ وقفہ اس کے انتظار میں۔

دوسری خبر یہ ہے کہ ہمارے کچھ براتی اسلام آباد "نظام مصطفےٰ" اور آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کی دلہن لینے گئے ہوئے ہیں مہر وغیرہ طے ہو چکا ہے رخصتی ہو کر آ جائے تو جہیز وغیرہ کا پتہ کرینگے۔

تیسری اور سب سے اہم خبر یہ کہ امریکی حکومت نے مجھے مجبور اور بے بس کر دیا ہے اور اب اس کا شکریہ ادا کیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے کہ اس نے پاکستان پر یہ احسان عظیم فرمانے کا فیصلہ کر لیا ہے کہ ہماری معاشی امداد بند کر دی جائے پاکستانی قوم کے لیئے یہ انتہائی احسان مندانہ اقدام ہوتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی ہے کہ امریکی گندم اور امریکی ماہرین کی امداد بند نہیں ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری کنک کی بربادی کا سامان ہوتا رہے گا اور امریکی "ماہرین" انتہائی مہارت سے ہماری جڑیں کاٹتے رہیں گے۔

چچا جان، مہربانی فرمائی ہی ہے تو مکمل فرمایئے جب سے آپکی گندم آنی شروع ہوئی ہے ہمار فصلیں یہ کر پکنے پکتے تباہ ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جہاں جہاں آپ کے ماہرین گھس بیٹھے ہیں وہاں وہاں ستیاناس ہو گیا ہے تعلیم کا شعبہ اس ضمن میں پیش پیش ہے اور بعض شعبے چونکہ ایسے ہیں جہاں فرشتے پر بھی نہیں مار سکتے ان کا بھی سنا ہے کنک والا ہی حال ہے۔

بہرحال کہ آپ نے بڑی حد تک ہم پر احسان کرنے کی ٹھانی ہے لہذا اپنے فیصلہ پر قائم رہیے گا خدا آپکو اس کی توفیق عنایت کرے۔ ہم اپنے مولانا مودودی سے بھی دعا فرمانے کی درخواست کریں گے کہ ان کی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔

لِلّٰہ اب آپ اپنے فیصلہ کو ہرگز تبدیل نہ کیجیے گا آپ کے مقامی کارندے کچھ بھی کریں کہ اگر آپ چند سال اپنے کہنے پر قائم رہے تو ہماری قوم کا کچھ تو زنگ اتر جائے گا۔ کچھ تو اس کے قوی حرکت کریں گے کچھ تو گھٹنوں ہی سے چلنے کی ترغیب ہو گی کچھ تو ہماری اگلی نسلیں کم مقروض ہونگی۔ کچھ تو ہماری ذہنی غلامی میں کمی آئے گی۔ آئندہ کے لئے پیشگی شکریہ!!

تنظیم آزادی فلسطین کا سفارتخانہ اسلام آباد

بقیہ: سرورق

کہ جب اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں تو بھی ان کے اظہار بلکہ عملی اظہار سے باز نہ آئیں تو بری بات ہے ہم اس لئے تو دعا کرتے ہیں کہ خدا جب بھی کسی کو صاحب اقتدار اور صاحب اختیار کرے تو اسے صاحب حوصلہ بھی کرے آمین۔

آج کل مارشل لاء کی اسلامی حکومت مزدوروں طالب علموں، کسانوں اور صحافیوں کے خلاف پوری شدت سے سرگرم عمل ہے۔ واہ آرڈیننس فیکٹری کے مزدوروں کے ساتھ جو روزانہ ہو رہا ہے۔ وہ کوئی دور کی بات نہیں ہے۔ گذشتہ ایک ہفتے سے شہر کی تمام اہم شاہراہوں اور جگہوں پر پولیس کے پہرے ہیں مگر پھر بھی مظاہرے ہوتے ہیں اور اس طرح ہوتے ہیں کہ پولیس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ پولیس کا بس چلتا ہے تو پرامن لوگوں پر۔ طلباء کا پروگریسو گروپ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے والا تھا کہ اس نے انہیں اس سے پہلے ہی دھر لیا۔ ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسئلہ کو حل کیا جائے اقتصادی بوجھ تلے دبے لوگوں کے درد کو ایرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر حل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دوسروں پر اعتراض کر کے حل کیا جا سکتا ہے جو لوگ مسٹر بھٹو پر فالکن طیارہ حاصل کرنے کا الزام لگاتے ہیں وہ اپنے لئے بوئنگ خرید کر اس کی اندرونی آرائش پر ۵۰ لاکھ روپے خرچ کریں تو نہ تو ہم ان کی سادگی پر یقین کرتے ہیں اور نہ ہی ہم ان کی سچائی کا یقین ہے۔ اقتصادی دباؤ سے گھر سے لوگ اور ان کا احتجاج بھی اقتصادی اداروں کے ملازمین سے ہی شروع ہوگا۔ اگر اس طرح بے خبری سے آنکھیں بند رکھی گئیں تو برے دن زیادہ دور نہیں ہیں کہ یہ نوشتہ دیوار ہے اور اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ جب بھی عوام نے بھوک مضبوط کرنے کی پڑی ہوئی ہے، صدر مملکت کا عہدہ خالی ہونے والا ہے اس کے باوجود کہ صدر کے پیشرو کے لئے آرڈیننس موجود ہے ایک اور قانون بنوانے کے لئے صدر فضل الٰہی چوہدری پر دباؤ ہے کہ اس آرڈیننس کی جگہ اب نیا آرڈیننس نافذ کیا جائے کہ کسی بھی شخص کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صدر مقرر کر سکیں گے یہ آرڈیننس بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے اسی لئے کہ صدر مملکت نے ابھی تک اس کی توثیق نہیں کی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ بساط اب اس طرح بچھائی جا رہی ہے کہ آئین کی حفاظت کے ضامن اس عہدے پر اب جنرل ضیاء الحق صاحب بذات خود متمکن ہو سکیں اور تمام اختیارات ان کی ذات میں ہی مرتکز ہو جائیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر جنرل اقبال کو مقرر کر دیا جاتے۔ قومی اتحاد نے یوں ہی حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بس پھر ہر طرح سے چین ہی چین ہے۔ مہنگائی کے بوجھ تلے دبے سسکتے چیختے چلاتے عوام، حکمرانوں کی بلا سے جہنم میں جائیں ان کے لئے تو اقتدار کی مسند سج ہی گئی ہے۔ جس پر وہ قابض ہیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے نام نہاد عہدیدار جو جمہوریت، اصول، آئین، پبلک اور نجانے کیا کیا کہتے رہے سب کو بھول کر نئے اصول مرتب کرنے پر تلے ہوئے ہیں کسی نے ان ہی کو نہیں کہا کہ اصول دوسروں کے لئے بنتے ہیں۔ سنا ہے ایک مولانا صاحب تھے۔ انہوں نے تقریر میں فرمایا کہ چوری گناہ عظیم ہے چاہے خاک کی ہو یا لاکھ کی۔ کھانا کھانے گھر آئے تو بیوی نے کہا کہ آپ بازار سے دہی لے آئیے۔ پوچھا کیوں، بیوی نے بتایا کہ پڑوسی کی مرغی پکائی ہے آپ نے کہا ہے کہ چوری حرام ہے اس لئے آپ دہی لے آئیں۔ مولوی صاحب نے کہا تم سالن نکالو، آخر مصالحہ اور گھی وغیرہ تو ہمارا ہی استعمال ہوا ہے۔ بیوی نے سالن نکالا تو مرغی کی ٹانگ بھی پلیٹ میں نکل آئی جو نیک بخت نے دوبارہ پتیلی میں ڈالنا چاہی۔ مولوی صاحب دیکھ رہے تھے چلا کر بولے ارے ارے یہ کیا کر رہی ہے یہ تو خود ہی نکل آئی ہے۔ بیوی نے کہا مولوی صاحب مرغی بھی خود ہی گھر میں آگئی تھی۔ مولوی صاحب نے منہ میں بھرے پانی کی کلی حلق سے آتارتے اور بولے ارے نیک بخت ہم نے بتایا یہ چوری نہیں ہے۔ تو مرغی نکال کر لے آ۔ کچھ ایسے ہی رول پاکستان قومی اتحاد والوں کے بھی ہیں کہ جس جرم میں بھٹو کو معتوب قرار دیا گیا اس سے زیادہ گھناؤنا جرم اب یہ خود اس لئے کر رہے ہیں کہ اس سے فائدہ خود ان کو پہنچے گا۔

پچھلے دنوں اسلام آباد میں عراقی سفارتخانے پر پہرہ اور سیکورٹی کا انتظام سخت کر دیا گیا۔ رد عمل کے طور پر تحریک آزادی فلسطین کے سفارتخانے پر حملہ کی توقع تھی ——— اس پر توجہ نہیں دی گئی اور اس وجہ سے ہی ہفتہ کے روز تین مسلح افراد نے اسلام آباد میں دن دھاڑے تحریک آزادی فلسطین کے سفارتخانے پر حملہ کر کے چار افراد کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ مسلح افراد جو عراقی بیان کئے جاتے ہیں سفارتخانہ کے سربراہ جناب یوسف ابو حنطاش کو تلاش کرتے اور انتقام انتقام چلاتے رہے یہ مسلح افراد ہرے رنگ کی ٹویوٹا کار میں سفارتخانے کے قریب اترے انہوں نے سفارتخانے کے دروازے پر سپاہی کی پوچھ گچھ کے دوران بدکلامی کی اس دوران تحریک کے وائرلیس آپریٹر نے اندر سے دیکھا وہ باہر آئے تو اس دوران ان افراد نے اپنے بریف کیس سے سب مشین گن نکال لی اور سپاہی اور وائرلیس آپریٹر دونوں کو بھون ڈالا وہ یہاں سے سفارتخانے کی عمارت میں داخل ہوئے انہوں نے استقبالیہ کے قریب جا کر ایک حریت پسند کو گولی مار دی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے جہاں انہوں نے باورچی خانے میں ایک حریت پسند کو گولی ماری انہیں کوشش کے باوجود یوسف ابو حنطاش نہیں ملے چنانچہ وہ سفارتخانہ کی پچھلی جانب اتر گئے۔ انہوں نے جاتے جاتے لان میں ایک دستی بم پھینک مارا اور باہر کود کر جنگل میں چلے گئے۔ حملہ آوروں نے سو سے زائد راؤنڈ فائر کئے چار افراد کو ہلاک کر دیا وہ آٹھ منٹ سفارتخانہ میں گھسے رہے اور چلے گئے دن دہاڑے یہ واقعہ اسلام آباد میں پیش آیا قریب ہی عراقی اور شامی سفارتخانوں پر پولیس کی بھاری جمعیت موجود تھی جو بعد میں بھی قریب نہیں آئی۔ تحریک آزادی فلسطین کا سفارتخانہ پاکستان میں جناب بھٹو کے دور

،ائم ہوا۔ یوں لگتا ہے موجودہ حکومت جنتا کو یوں ہی فلسطینیوں سے ہمدردی نہیں ہے۔ اسی لئے تو فلسطینی سفارتخانہ پر پہرے کا اہتمام یہ تھا کہ تین سپاہیوں کو ایک تھری ناٹ تھری رائفل دی گئی تھی گویا پہرے کا اہتمام تکلفاً ہی تھا۔ سفارتی آداب میں بڑی نزاکتیں ہوتی ہیں انتہائی دشمن ممالک کے سفیر بھی کسی ملک میں ہوں تو آپس میں ٹھیک سے ملتے جلتے ہیں کبھی میزبان ہی اپنی نفرتوں اور بغضوں میں اتنے شدید ہو جائیں کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سزا معاف کر دی جاتے۔ حکمران گروہ اپنی سوچ میں حق بجانب ہے کہ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پھر بھٹو دشمنی میں اس قدر دور تک جانے کی کیا ضرورت تھی اور وہی اس شرط کے قبول کئے جانے میں رکاوٹ ہیں۔ امریکہ کی جانب سے اقتصادی امداد بند کرنے کا اعلان دورۂ جالوت کے دوران ہونے کا منصوبہ ہے کہ لیبیا مجبور ہو کر اپنی شرط چھوڑ کر بلا شرط پاکستان کی مدد کر دے رہ گئی ری پراسیسنگ پلانٹ کی خریدنے کی بات تو ہمیں پاکستانیوں تک اپنی یہ اطلاع سب سے پہلے پہنچانے میں فخر ہے کہ فرانس اور پاکستان کے مابین اس سودے کا معاہدہ ختم ہو گیا ہے اس کا صرف رسمی اعلان ہی باقی ہے جس روز یہ اعلان ہوا امریکہ پاکستان کو اپنی اقتصادی امداد بحال کر دے گا۔ ملٹری جنتا اور اس کے نئے حواری جنہوں نے (پاکستان قومی اتحاد) اب حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے گلے پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہیں کہ ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ ہم ضرور حاصل کریں گے اس چیخ و پکار سے اب کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ سانپ نکلنے کے بعد لکیر پیٹنے سے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ یہ چیخ و پکار اپنے محب الوطن اور وطن دوست ہونے کی دلیل کے طور پر کی جائے گی جب کہ کل اس کے برعکس کیا گیا ہے۔ خاموشی سے صورتِ حال کو خراب سے خراب تر ہوتے دیکھتے رہے اور جب بات ناقابلِ حل ہو گئی تو چلانا شروع کر دیا۔ ملٹری جنتا کی لاپرواہی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی تو بھارتی وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے شاہراہ قراقرم کی تعمیر کو بھارتی علاقے میں مداخلت اور چین کے رویہ کو غیر دوستانہ قرار دیا مگر ملٹری جنتا کے حب الوطن افراد نے اس مسئلے پر کچھ نہیں کیا۔ وزارت خارجہ کے ترجمان خاموش رہیں اور پوری حکومت زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی شکل بنی ہوئی ہے۔ وجہ اس سب کی یہ ہے کہ انہیں اپنے اقتدار کو محسوس کی ہے۔ ورنہ [illegible] نے ان کا [illegible] نے اس پر شدید رد عمل [illegible] ہے اس [illegible] کریں ہیں

بڑے بڑے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے یہی تاریخی عمل ہے جس سے کوئی غاصب اور عوام دشمن نہیں بچ سکتا۔ ہمارا کام سمجھانا ہے اگر سمجھ میں آئے تو ٹھیک ورنہ پھر علامہ اقبال نے تو برسہا برس پہلے کہا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اور علامہ اقبال واقعی تم سے بڑے فلاسفر اور مفکر تھے۔

بقیہ :- اندرون سندھ

افسران کو مکان کا کرایہ ساٹھ فیصد دیا جا رہا ہے کنوینس الاؤنس ماضی کے چالیس روپے میں دس روپے بڑھا کر پچاس روپے ماہانہ کیا گیا ہے۔ اور موٹر سائیکل رکھنے کی شکل میں ساٹھ روپے ماہانہ دیا جائے گا جب کہ افسران کو موٹر سائیکل رکھنے کی شکل میں ڈیڑھ سو روپے دیئے جائیں گے۔ حالانکہ موٹر سائیکل کا خرچ دونوں جانب یکساں ہے۔ والدین کے علاج و معالجہ کی سہولت نہیں دی گئی۔ لوکل کمپنیٹری الاؤنس اور بونس کی شرح میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ پروموشن کے مسئلہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح مکان اور موٹر سائیکل کی خرید کے قرضہ جات کی رقم قیمتوں کے لحاظ سے ناکافی ہے۔

مالیاتی اداروں کے ملازمین نے ملک گیر سطح پر ایک ایکشن کمیٹی ترتیب دی ہے۔ تیرہ مطالبات کا چارٹر حکومت کے سامنے ہے۔ مطالبات کی تکمیل کے لئے پہلی کڑی کے طور پر ملازمین کے جلسے جاری ہیں۔ راست اقدام کی تلوار کھڑی ہے۔ ملک کے ایک لاکھ سے زائد بینک ملازمین کی بے چینی معمولی بات نہیں ہے۔

بقیہ: غیبتوں کی ڈائری

این ڈی پی کے چھ رہنماؤں کا بیان اور ترجمان کی تردید

ظاہر ہے ان کا اشارہ بلوچوں اور پختونوں کی طرف تھا مگر بعد میں این ڈی پی کے عقابوں نے دوسرے دن کہا کہ مزاری صاحب خود ان ریمارکس پر پشیمان ہیں۔ لہٰذا این ڈی پی کے ۶ رہنماؤں کی طرف سے ایک وضاحتی بیان آیا کہ مزاری صاحب سے غلط بیان منسوب کیا گیا ہے۔ ان رہنماؤں نے بلوچستان کے پختونوں اور افغان حکومت کے بارے میں این ڈی پی کا (بقول ان کے) تسلیم شدہ موقف دہرایا۔ مگر اس وضاحت کی اشاعت کے دوسرے دن ہی این ڈی پی کے ترجمان کا ایک اور بیان شائع ہوا کہ اس وضاحت سے این ڈی پی کے سربراہ کا کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح این ڈی پی کے اس ترجمان نے این ڈی پی کے ۶ رہنماؤں کے گال پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا اب پتہ نہیں یوسف مستی خان، فصیح سالار شاہ محمد شاہ، اور قمر راجپڑ کا کیا حال ہے۔ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے۔ "عابد زبیری" جندہ باد"

بقیہ: چور مچائے شور

"YOUTH FOR ZIONISM" اور برطانوی وزیر اعظم کیلاہن کا اس غوغا آرائی میں ہم آواز ہے۔

ٹائم اور نیوز ویک جیسے امریکی رسالوں سے سیاسی سوچ اور دانشورانہ بصیرت حاصل کرتے وقت مولوی محمد صلاح الدین اپنی بصارت نہ کھو چکے ہوتے تو انہیں اقوام متحدہ میں سیاہ فام امریکی مندوب کا یہ حرفِ حق بھی نظر آتا کہ اس وقت امریکہ میں ہزاروں سیاسی قیدی موجود ہیں اور دس سال پہلے انسانی حقوق کے حق میں آواز اٹھانے پر اس سیاہ فام امریکی باشندے اینڈریو ینگ پر اٹلانٹا کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ امریکہ اور دیگر مغربی ملک جنوبی افریقہ اور روڈیشیا کی نسل پرست حکومتوں کی حمایت کر کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ یہ مولوی محمد صلاح الدین کا نہیں اُن کی بصارت اور بصیرت کا قصور ہے کہ انہیں ٹائم اور نیوز ویک میں چھپنے والی وہ گندی گالیاں بھی نظر نہیں آئیں جو اس حرفِ حق کے کہنے پر امریکی حکمرانوں نے اینڈریو ینگ کو دی ہیں۔

مولوی محمد صلاح الدین کا اخبار لکھتا ہے کہ گو کہ روسیوں نے شرانسکی پر مغربی ملکوں کے لئے" جاسوسی کرنے کے الزامات کی تفصیل بتلاتے ہوئے سی۔ آئی۔ اے کا نام نہیں لیا تھا لیکن اس کے باوجود صدر کارٹر نے فوری طور پر تردید کر دی کہ شرانسکی کا سی۔ آئی۔ اے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

گلاب پیرزادہ سے بات چیت

حکام اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے بارے میں مخلص نہیں

مزدور ہر قدم اور ہر محاذ پر صحافیوں کے ساتھ ہیں

لاڑکانہ کو ہر دورِ حکومت میں نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں تو بھٹو خاندان کے اس ضلع سے تعلق کی بنا پر خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور غیر ملکی سفیر اور سربراہانِ حکومت یہاں قیام کرتے تھے۔ لیکن مارشل لاء کے نفاذ اور سیاسی کارکنوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے بعد سے ملکی سیاست میں یہ ضلع کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ اس دوران الائیڈ ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کی جدوجہد نے اخبارات اور خاص طور پر ملک کے محنت کش طبقے کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ اس جدوجہد کی قیادت لاڑکانہ لیبر فیڈریشن کر رہی ہے۔ اس جدوجہد کے دوران فیڈریشن کے قائدین کے ساتھ ائرپورٹ ڈیویلپمنٹ ایجنسی کا موئن جودڑو کے صدر گلاب پیرزادہ نے فیڈریشن کے قائم مقام جنرل سکریٹری کی حیثیت میں، روپوش رہ کر، نمایاں کردار ادا کیا۔ پچھلے دنوں ان سے الفتح مطبوعات کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات اور گفتگو میں جو باتیں سامنے آئیں وہ مختصراً پیشِ خدمت ہے۔

جناب گلاب پیرزادہ نے بتایا کہ لاڑکانہ لیبر فیڈریشن میں، ہائی وے ڈپارٹمنٹ، ائرپورٹ ڈیویلپمنٹ، بیڑی کی صنعت، ہوٹلوں کے ملازمین، شوگر ملوں، رائس ملوں، اینٹوں کے بھٹوں کے مزدور، گدھا گاڑی چلانے والوں اور ٹیکسٹائل ملوں کے مزدوروں کی یونینیں شامل ہیں جن کے اراکین کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ہر ٹریڈ یونین تنظیم کی طرح اس فیڈریشن سے متعلق مزدور بھی مختلف سیاسی سوچ رکھتے ہیں۔ اور فیڈریشن ان تمام مزدوروں کو مشترکہ مسائل کی بنیاد پر متحد اور منتظم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ فیڈریشن سکھر ڈویژن کی مزدور رابطہ کمیٹی کی رکن ہے۔ ہم نے صوبے اور ملک کے دوسرے علاقوں کے مزدوروں کی جدوجہد میں اپنی طاقت کے مطابق تعاون کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ان مزدوروں نے ہماری جدوجہد میں تعاون اور حمایت کی ہے۔ فیڈریشن کی سوچ کی وضاحت کرتے ہوئے جناب گلاب پیرزادہ نے کہا کہ "ہم مشترکہ جدوجہد میں ایمان رکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ معاشرے کے اصل معمار محنت کش طبقات ہوتے ہیں اس وجہ سے ہمارا ملک بھی اسی صورت میں صحیح معنی میں ترقی کر سکتا ہے جب اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو یا وہ اقتدار میں موثر حصہ دار ہوں۔ ہماری دشمن طاقتیں وہ ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کیلئے سرمایہ اکھٹا کرنا اور محنت کشوں کا استحصال جاری رکھنا چاہتی ہیں۔ خواہ وہ سرمایہ دار ہوں، جاگیردار یا کسی بھی نوعیت کی نوکرشاہی۔ ہم ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو محنت کشوں کے استحصال سے پاک ہو۔ جہاں سامراجی تسلط نہ ہو اور جہاں ہر قسم کا سماجی اور قومی انصاف ہو"۔

بھوک ہڑتال کی صورت میں یکم جولائی کو شروع ہونے والی جدوجہد کا پس منظر بیان کرتے ہوئے گلاب پیرزادہ نے بتلایا کہ "ہم نے جدوجہد شروع کرنے سے پہلے ضلعی حکام سے بات چیت کی اور اپنے مطالبے پیش کئے۔ چند مطالبات یہ تھے، بیڑی بنانے والوں کی سابقہ اجرت ۲۵ روپے ہزار بحال کی جائے جو مارشل لاء کے بعد گھٹا کر ۲۰ روپے ہزار کر دی گئی ہے، الائیڈ سلک ملز جو چھ ماہ سے بند پڑا تھا اسے کھلوا کر مزدوروں کو فاقہ کشی سے بچایا جائے اور مزدوروں کے بقایہ جات ادا کروائے جائیں۔ ہائی وے ڈپارٹمنٹ کے ٹیکنیکل عملے کو ریگولرائز کر کے انہیں ۱۹۷۲ء سے قومی پے اسکیل دیا جائے جو سندھ کے پانچ اضلاع میں اب تک نہیں دیا گیا ہے۔ رائس ملوں میں چھانٹی بند کرائی جائے اور ان میں مزدوروں قوانین پر عمل کروایا جائے۔ ہر شعبے میں مزدوروں کی چھانٹی رکوائی جائے۔ گرفتار صحافیوں کو رہا کر کے ان کے با اختیار نمائندوں سے مذاکرات کئے جائیں۔ ان کے مطالبات تسلیم کئے جائیں۔ صحافت کو پابندیوں سے آزاد کیا جائے۔ تمام گرفتار شدہ مزدوروں، کسانوں، طلباء اور سیاسی کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں حالات بہتر بنانے کی بجائے انتظامیہ نے مخالفانہ رویہ اپنایا۔ پہلے مجھے گرفتار کیا گیا۔ لیکن اے ڈی اے یونین اور ملک کے دوسرے علاقوں کے مزدوروں کے دباؤ کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہمارے سکریٹری عبدالعزیز عباسی کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے۔ بعد میں یوم مئی پر مزدوروں سے بات چیت کے بعد یہ وارنٹ واپس لے لئے گئے۔ لیکن کوئی مطالبہ پورا نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد یکم جولائی سے بھوک ہڑتال تحریک شروع ہوئی جس میں آٹھ دن کے اندر ۷۰ سے زائد مزدور گرفتار ہوئے۔ حکام نے اس تحریک کو کچلنے کی پوری پوری کوشش کی۔ مزدوروں پر وحشیانہ تشدد کیا گیا لیکن مزدوروں کے عزم اور جوش و خروش کے سامنے انتظامیہ بے بس ہو گئی تو گرفتار شدہ مزدوروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر کے مذاکرات کا راستہ اختیار کیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ ۱۵ دن کے اندر اندر مزدوروں کے مطالبات پورے کر دیئے جائیں گے اس یقین دہانی کے نتیجے میں مزدوروں نے عارضی طور پر بھوک ہڑتال کی تحریک ملتوی کر دی لیکن اب نظر آتے لگا ہے کہ حکام اپنا وعدہ پورا کرنے کے بارے میں مخلص اور سنجیدہ نہیں ہیں اسی لئے مطالبات اب تک پورے نہیں ہوئے ہیں"۔

گلاب پیرزادہ نے اس بات پر شکریہ ادا کیا کہ "پربھات" کے پچھلے شمارے میں الائیڈ ٹیکسٹائل کے مسئلے پر رپورٹ شائع ہوئی۔ ساتھ ہی انہوں نے نشاندہی کی کہ اس رپورٹ میں یہ ایک بات درست نہیں ہے کہ ہمارے چند مطالبات پورے کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صرف ایک مطالبہ پورا کیا گیا ہے یعنی صرف بیڑی مزدوروں کی سابقہ اجرت بحال کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مطالبہ نہیں مانا گیا ہے۔

جناب گلاب پیرزادہ نے صحافیوں کی جدوجہد کے بارے میں کہا کہ "یہ ضمیر کی آزادی" اظہار کی آزادی اور صحافت کی آزادی کی جدوجہد ہے۔ اس جدوجہد میں صحافی ساتھیوں نے شاندار روایات قائم کی ہیں۔ متوسط طبقہ اور سفید کالر والے لوگوں میں موقعہ پرستی کا رجحان ہمیشہ پایا جاتا ہے اس کے باوجود صحافیوں نے حکومتی جبر اور غدار ٹولے کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا ہے۔ فیڈریشن اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر قدم پر ہر محاذ پر ان کے ساتھ ہے"۔ انہوں نے مزید کہا کہ فیڈریشن کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ آج تک جتنی کتابوں رسائل، پریسوں اور اخبارات پر پابندی ہے اسے ختم کیا جائے اور خاص طور پر سندھی زبان کے رسائل اور کتابوں پر پابندی کی سختی سے مذمت کرتی ہے۔

WEEKLY PERBHAAT

صحافیوں کو ہتھکڑی نہیں پہنائی گئی سرکاری اعلان

ناصر زیدی

آزادیٔ صحافت کے لئے کوڑوں کا ہدف اور زنجیر بہ پا